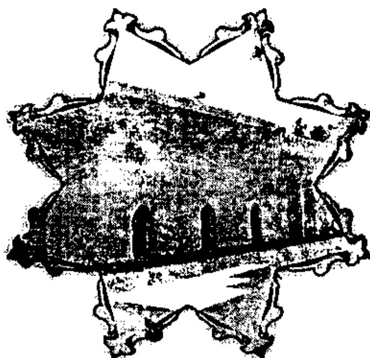
تذکرہ مفکر اسلام

یعنی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
اور ان کے افراد خاندان کا ایک دل آویز مرقع

حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی



ترتیب و پیشکش

محمد ارمغان بدایونی ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ مطابق فروری ۲۰۱۵ء

نام کتاب : تذکرہ مفکر اسلام

نام مؤلف : حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

ترتیب وپیشکش : محمد ارمغان بدایونی ندوی

صفحات : ۱۳۶

قیمت : Rs. 80/-

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب، ندوہ روڈ، لکھنؤ ☆ مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ناشر :

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ

حضرت سیدہ امۃ العزیز صاحبہؒ

حضرت سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
شخصیت کے تشکیلی عناصر

حضرت مولاناؒ اور تصوف وسلوک

افادات حسنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد سے آج تک بیسیوں کتابیں حضرت کی حیات وخدمات پر لکھی گئیں، اوران کا سلسلہ جاری ہے، پیش نظر کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ متفرق مضامین گھر کے ایک ایسے فرد کی طرف سے ہیں، جو حضرت کے قریب ترین معتمد حضرات میں سے تھے، اورانہوں نے اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک حضرت رحمہ اللہ کی صحبت اٹھائی، اپنی زندگی حضرت کی تربیت میں گزاری، اور حضرت کے معتمد خاص اور مجاز بیعت قرار پائے، اپنی زندگی میں حضرت اکثر وبیشتر مختلف مواقع پر ان کو اپنی جگہ بھیجتے تھے، اوروہ حضرت کی ترجمانی فرماتے تھے۔

راقم کے مربی برادر اکبر حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا رسا ذہن عطا فرمایا تھا، انہوں نے حضرت مولانا سے زندگی کے بعض ایسے گوشوں میں بھی فائدہ اٹھایا، جدھر ہر ایک کی نظر نہیں جاتی، وہ حضرت مولانا کے طریقہ زندگی اور طریقہ دعوت وفکر کو سامنے رکھ کر ایسی باریک باتوں کی طرف توجہ دلاتے تھے، جو خاص وعام کے لیے مفید اور رہنما ہیں، انہوں نے خود بھی اپنی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھایا اور سینکڑوں ہزاروں کو فائدہ پہنچا۔

حضرت مولانا کی وفات کے بعد انہوں نے حضرت پر مختلف مضامین میں ان باریکیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اوران کی مجلسوں میں بھی اکثر وبیشتر یہ باتیں ذکر میں آتی تھیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ عزیز گرامی مولوی محمد ارمغان ندوی سلمہ نے ان کی طرف بھی توجہ کی اور یہ ساری چیزیں انہوں نے ایک جگہ جمع کر دیں، عزیز موصوف کو اللہ جزائے خیر دے، انہوں نے اس سے پہلے بھی مولانا کے دروس اور تقریروں پر خاصا کام کیا، اور متعدد کتابچے اور رسائل منظر عام پر آچکے ہیں۔

یہ کتاب مولانا کے مضامین کے علاوہ ان کے ان ملفوظات کا مجموعہ بھی ہے جن میں انہوں نے حضرت مولانا کا تذکرہ فرمایا ہے، افادات حسنہ کے عنوان سے یہ خاصے کی چیز تیار ہوگئی ہے، اس کے علاوہ اس میں حضرت مولانا کے خاندان کا بھی تذکرہ آگیا ہے، اس طرح یہ ایک گلدستہ بن گئی ہے جس کی خوشبو سے ہر ایک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

میں عزیزی ارمغان سلمہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو بھی قبولیت عطا فرمائے، اور وہ ہر ایک کے لیے مفید ہو۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرکز الامام أبی الحسن الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی

۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین خاتم النبیین وسیدنا محمد بن عبد اللّٰہ الصادق الأمین وعلی آلہ الطیبین الطاہرین وأصحابہ الغر المیامین وعلی من تبعھم باحسان ودعا بدعوتہ الی یوم الدین، أما بعد!

اللہ تعالیٰ نے مختلف اور الگ الگ صلاحیتوں سے انسان کو نوازا ہے، برادر زادۂ عزیز مولوی سید عبد اللہ حسنی ندوی جو ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز فضلاء میں ہوئے، ایک داعی اور خطیب کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہوئے، اور اپنے مواعظ و مجالس کے ذریعہ انہوں نے معاشرہ کی اصلاح اور لوگوں کے دلوں کو اللہ سے جوڑنے اور کفر وشرک کے اندھیروں سے نور ایمان کی طرف لانے کا کام کیا، اور توقع کی جا رہی تھی کہ وہ آگے چل کر ایک صالح انقلاب لانے کا ذریعہ بنیں گے کہ عین جوانی میں انہوں نے سفر آخرت اختیار کر لیا، ان کے انتقال کے بعد ان کے علمی وتصنیفی کاموں کی طرف ان کے محبین اور شاگردوں نے توجہ کی، اور ان مضامین کو یکجا کیا جو انہوں نے مختلف مناسبتوں سے عربی اور اردو میں تحریر کئے تھے، عربی کے مضامین ''الرائد'' کے شماروں سے جمع کئے گئے، ان میں سیرت نبوی سے متعلق ایک مجموعہ مضامین شائع ہو چکا

ہے، اردو مجموعہ مضامین میں بعض شخصیات سے متعلق ان کے بڑے مؤثر اور مفید مضامین سامنے آئے، جن میں ایک مجموعہ مضامین عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کی دلآویز شخصیت سے متعلق ہے، اور دوسرا مجموعہ مضامین مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ہے، پیش نظر کتاب انہی مجموعہ مضامین اور ان مجالس وافادات پر مشتمل ہے جو خال مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے افراد سے متعلق تھے۔

ان میں پہلا مضمون حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء ومصنف نزہۃ الخواطر) سے متعلق بڑا تحقیقی وعلمی مضمون ہے، جو اردو اکادمی اتر پردیش کے زیر اہتمام ''علامہ عبدالحی حسنی سیمینار'' کے لیے لکھا تھا، اس سے ان کی بڑی علمی، تحقیقی، ادبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اگر وہ یہ کام کرتے تو وہ بڑے مصنف ومحقق کے طور پر بھی معروف ہوتے، مولانا حکیم عبدالحی صاحب نے دین ودعوت کے مختلف شعبوں کو جمع کیا تھا، اور ان کے یہاں تناسب کا وصف بہت نمایاں تھا، فرائض وحقوق کی ادائیگی اور جس چیز کو جتنا حصہ دینا چاہیے اس کا پورا خیال اور رضائے الٰہی کے حصول کا پورا استحضار رہتا تھا، ان کا یہ وصف ان کے فرزند اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) میں منتقل ہوا، وہ تقرب بالفرائض کو تقرب بالنوافل پر ترجیح دیتے تھے، اگرچہ انہوں نے تصنیفی مشغلہ اختیار نہیں کیا، لیکن اپنے بھائی، اولاد اور بہن کی اولاد کو اپنی تربیت میں ایسا تیار کیا کہ جو زمانہ کے تقاضوں اور ضرورت کو اچھی طرح سمجھیں، اور اپنی صلاحیتوں کو دین کے لیے بروئے کار لائیں، عزیزی مولوی سید عبداللہ حسنی ان کے بڑے پوتے ہیں، اور انہیں ان کی اچھی توجہ اور خوب محبت بھی ملی، جس کا ان پر یہ اثر ظاہر ہوا کہ غیر مسلموں میں دعوت کی ان کی فکر وجذبہ کو انہوں نے اپنا حال بنا لیا تھا، جس کے اچھے نتائج بھی لوگوں کے سامنے آئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے کو اپنے بھائی کی تربیت کا حصہ قرار دیتے تھے۔

مولانا کی والدہ معظمہ جو بڑی برگزیدہ اور صاحب دل خاتون تھیں اور ان کی بہنوں سے متعلق مضامین حضرت مولانا قمرالزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ نے اپنی کتاب ''اقوال سلف'' کے لیے عزیزی عبداللہ حسنی مرحوم سے لکھوائے تھے، اور ان سب کی خاص بات یہ ہے کہ زندگی کے اعمال کو اللہ کی رضا جوئی کے جذبہ سے انجام دیا جائے، اور جو چیزیں ضروری قرار دی گئی ہیں انہیں غیر ضروری چیزوں پر مقدم رکھا جائے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پورے عالم اسلام کی رہنمائی کا کام کر رہی تھی اور تحریک پیام انسانیت کے ذریعہ انہوں نے غیر مسلموں میں اصلاح و دعوت کا کام بھی موثر انداز میں کیا، عزیزی مولوی عبداللہ حسنی مرحوم نے ان کی شخصیت کی تشکیل کے اہم اور بنیادی عناصر پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے، ان کا یہ مضمون ''الشارق'' اعظم گڑھ کے مفکر اسلام نمبر میں شائع ہوا تھا، اور دوسرا اہم مضمون جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی خصائص و امتیازات اور ارشاد و تربیت کے پہلو پر ہے وہ تعمیر حیات کے مفکر اسلام نمبر کے لیے لکھا گیا تھا، اس کے علاوہ عزیز مرحوم نے اپنے خطبات و مواعظ و مجالس میں جو اہم باتیں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق بیان کی تھیں، ان کو بھی پیش نظر کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، اور یہ کام مولوی محمد ارمغان ندوی بدایونی (رفیق مرکز الامام أبي الحسن الندوي، دار عرفات) نے خوش اسلوبی اور سلیقہ سے انجام دیا ہے، وہ اس سے پہلے عزیز مرحوم کے خطبات و مواعظ کو سی ڈی اور کیسٹوں سے تحریر میں لانے اور ترتیب دے کر شائع کرنے کا کام بھی کر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کو قبول فرمائے، اور یہ ان کی علمی و دینی ترقی کا ذریعہ بھی بنے۔ آمین.

محمد واضح رشید حسنی ندوی

یکم جمادی الأولی ۱۴۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ کی حیات وخدمات اور افکار ونظریات پر مختلف اصحاب علم وذوق اور قرابت داروں نے مفصل مضامین اور کتابیں ترتیب دیں، جس نے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کو جتنا سمجھا، اس نے اپنے تجربہ کی روشنی میں حضرت کی شخصیت کو متعارف کرایا۔

پیش نظر کتاب حضرت مولاناؒ کے معتمد علیہ، ان کے خاص تربیت یافتہ، اوران کی دعوت وفکر کے امین مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے مضامین کا مجموعہ ہے، مولاناؒ کی بڑی خواہش تھی کہ نوجوان طلباء اور سرگرم دعوتی افراد کے درمیان کوئی ایسی خاص نشست منعقد کی جائے، جس میں حضرت مولاناؒ کے افکار ونظریات اوران کی شخصیت کے تشکیلی عناصر پر تفصیلی گفتگو کی جائے ،لیکن مولانا کی گوناگوں مصروفیات اور پھر اخیر وقت میں مسلسل بیماری کی وجہ سے اس کی نوبت نہ آسکی، البتہ آپ اپنی مجلسوں اور تحریروں وتقریروں میں اس پر ضرور روشنی ڈالتے رہے جو کہ مختلف شکلوں میں محفوظ ہے۔

مولانا کے انتقال کے بعد آپ کے متعلقین نے آپ کے خطبات کو مرتب کرکے یکجا شائع کرنے کا تقاضا کیا، چنانچہ مولانا مرحوم کے جانشین و برادر خورد مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ نے یہ اہم ذمہ داری راقم سطور کے سپرد کی، اسی دوران آپ کے خطبات ومضامین میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ سے متعلق خاصے کام کی چیزیں بھی نظر آئیں جن کے منتشر ہونے کی وجہ سے عمومی استفادہ ممکن نہ تھا، راقم نے مخدوم ومکرم مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کے حسب ایماء ان منتشر مضامین کو یکجا

کرنے کی سعادت حاصل کی۔

ان مضامین میں حضرت مولاناؒ کی شخصیت کے تشکیلی عناصر اور تصوف وسلوک سے متعلق آپ کے معتدل افکار ونظریات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اخیر میں ''افادات حسنہ'' کے عنوان سے مولاناؒ کے ملفوظات وہدایات کو پیش کیا گیا ہے جن میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور قیمتی ہدایات کو بیان کیا گیا ہے۔

مولاناؒ نے حضرت مولاناؒ کے والد ماجد، والدہ محترمہ اور دونوں ہمشیرہ سے متعلق بھی مضامین تحریر فرمائے تھے، مولانا محمود حسن حسنی ندوی مدظلہ کے مشورہ اور ان کی حسب ہدایت ان مضامین کو بھی شامل کرلیا گیا تاکہ حضرت مولانا کا یہ تذکرہ مکمل ہوجائے اور قارئین ان مثالی شخصیات کی خدمات اور ان کے مقام کا تعارف بھی حاصل کرسکیں، البتہ حضرت مولانا کے برادر اکبر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کا تذکرہ مولانا کے قلم سے نہ مل سکا، چنانچہ اس خلا کو مولانا محمود حسن حسنی ندوی کے مضمون سے پورا کرلیا گیا جو مولانا کی سرپرستی اور نگرانی میں ہی تیار کیا گیا تھا۔

راقم سطور خصوصی طور پر حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ العالی (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) کا بے حد ممنون ومشکور ہے کہ حضرت والا نے اپنی تمام تر مصروفیات اور طبیعت کی ناسازی کے باوجود بیش قیمت مقدمہ تحریر فرمایا جو راقم کے لیے باعث سعادت وصد افتخار ہے۔ راقم مخدوم ومکرم مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کا شکر گذار ہے کہ ان ہی کی ہدایات اور توجہات سے یہ کام مکمل ہوسکا، اسی طرح مولانا محمود حسن حسنی ندوی کا بھی ممنون ہے کہ ان کی نگرانی اور رہنمائی مسلسل حاصل رہی۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ ان سبھی ساتھیوں اور محسنین کو بہترین جزاء عطا فرمائے جن کی رہنمائی وتوجہات اور مختلف قسم کا تعاون ملتا رہا۔

اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قبول فرمائے اور صاحب کتاب اور راقم کے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین!

محمد ارمغان بدایونی ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ

(والد ماجد مفکر اسلام)

انسان کے فطری جوہر چمکانے، خفیہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اس کے اوصاف پسندیدہ اور کمالات کو ٹھکانے لگانے اور اس کی سمت متعین کرنے میں موروثی اثرات اپنا پورا کام کرتے ہیں، اگر اس کے ساتھ فضا و ماحول کی سازگاری کی فراہمی بھی ہو تو اس کی آب و تاب میں چار چاند لگ جاتے ہیں، اور اس کا ستارہ اقبال بلند سے بلندتر اور اس کی روشنی تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ بھی ان بلند اقبال اور خوش قسمت افراد میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ایسے خصائص و کمالات سے نوازا جو کم لوگوں کے حصہ میں آتے ہیں، ایک طرف تو ان کو ایسے خاندان میں آنکھ کھولنے کا موقع ملا جہاں ماضی بعید سے لے کر ماضی قریب تک ایسے باکمال و باتوفیق حضرات پیدا ہوئے جن کے قابل فخر کارناموں کے تذکرے، ان کے اصول زندگی، عقائد و مسلمات اور قدروں سے ان کے کام و دہن آشنا ہوئے، اور ان کے دل کی آواز بن گئے، جس کو وہ ہمیشہ سینہ سے لگائے رہے، اور جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ ان کے والد ماجد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''مولانا سید عبدالحی صاحب کے والد ماجد بھی ایک فاضل یگانہ تھے، شعر و سخن، تاریخ و سیر کے ماہر اور داستان کہن کی بولتی زبان تھے، ان کا سفینہ ایک یادگار چیز ہے، اور ان کا تذکرہ ان کے عہد کا تاریخی سرمایہ ہے، مولانا سید عبدالحیؒ کو یہ

ذوق فن باپ ہی سے وراثت میں ملا تھا''۔(۱)

اس کے علاوہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اجداد قریب کی امتیازی صفات، بیٹوں، پوتوں کی طرف منتقل ہوتی ہیں، مولانا کے جدامجد اور والد صاحب انسانی صفات کا مرقع اور اعلیٰ اسلامی صفات کے آئینہ دار تھے۔

جس دور میں آپ نے آنکھیں کھولیں، اس میں ایک طرف ۱۸۵۷ھ کے ہنگامۂ رستخیز اور انگریزی حکومت کے استقرار کو تیرہ برس ہوئے تھے، مسلمانوں کی سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا، اور بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ''یہ دو تہذیبوں اور زندگی کے فلسفوں کے تبادلہ اور دو موسموں اور فصلوں کے تداخل کا زمانہ تھا''(۲)

انگریزی حکومت اپنے ساتھ جو تہذیب وثقافت، فلسفہ زندگی، طرز معاشرت اور نظام تعلیم لائی تھی، اس کا سب سے زیادہ مقابلہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت کے بچے کچے افراد اور ان کے حلقہ بگوش علماء ومشائخ نے کیا تھا، گویا حمیت اسلامی اور غیرت ملی کے سب سے بڑے علمبردار اسی جماعت کے لوگ تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ سے مولانا عبدالحی صاحب کا نسبی تعلق تھا، جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مولانا کسی طرح یہ نہیں پسند کر سکتے تھے کہ انگریزی حکومت کی لائی ہوئی یا صحیح لفظوں میں تھوپی ہوئی تہذیب کھلے دل قبول کر لیں، یہ دبی ہوئی چنگاریاں بار بار ان کے دل ودماغ میں سلگتی تھیں، اور جب ذرا ہوا چلتی تھی وہ سلگنے لگتی تھی، ادھر ندوۃ العلماء کی تحریک کی ابتداء ہوئی، ادھر مولانا سید عبدالحی صاحبؒ نے اس کی صدا پر لبیک کہا اور تادم آخر نبھا کر دکھایا۔

یہ گروہ اپنی بساط بھر عزم وہمت کے ساتھ اس کا مقابلہ کر رہا تھا، اور جو چراغ ان کے اسلاف نے اس برصغیر میں روشن کیا تھا، اس کو بجھنے سے بچا رہا تھا، بقول حضرت مولاناؒ: کچھ قلندر صفت درویش ایسے تھے جو ہوا کے ان تیز جھونکوں میں اس چراغ کو اپنے سینے سے لے کر بجھنے سے بچا رہے تھے، اور انہوں نے جا بجا اپنے سوز دل اور نور باطن سے ایسی روشنی پیدا کر دی کہ شام غریباں میں بزم چراغاں کا دھوکہ ہوتا تھا''(۳)

---

(۱) یاد رفتگاں، ص:۴۷ (۲) حیات عبدالحی، ص:۵۱ (۳) ایضاً، ص:۵۱

حسن اتفاق انہی درویش صفت بزرگوں میں دو بزرگ ایسے تھے جو اپنے علاقہ کے مسلم الثبوت شیخ اور بلند پایہ مربی تھے، ایک کا تعلق مولانا کے نانیہال ہنسوہ ضلع فتح پور اور دوسرے کا تعلق دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی سے تھا۔

دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی محبوبیت ومقبولیت عطا فرمائی تھی کہ پروانوں کی طرح لوگ خدمت میں حاضر رہتے اور استفادہ کرنے والے مختلف جگہوں سے آتے جاتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

”دونوں جگہ دو بڑے شیخ ومربی جن سے آپ کو تعلق خاندانی کے علاوہ قرابت قریبہ حاصل تھی موجود تھے، ہنسوہ میں حضرت شاہ احمد سعید دہلوی کے خلیفۂ اجل مولانا سید عبد السلام واسطی جو آپ کی والدہ کے حقیقی چچازاد بھائی تھے، اور دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب جو آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب کے رشتہ میں ماموں اور روحانی رشتہ سے بھائی تھے، دونوں بزرگوں کو قرابت قریبہ نیز آپ میں رشد وترقی دیکھ کر آپ سے خصوصی تعلق تھا، اور آپ کے حال پر اولاد کی طرح شفقت تھی“۔(۱)

ایسے ماحول، ایسی فضا اور ایسی شخصیتوں کے زیر سایہ رہ کر پروان چڑھنے والی شخصیت جو نگاہ دور بیں اور دل دردمند بھی رکھتی ہو، اور ماحول اور فضا سے متاثر بھی ہوتی ہو، اگر جامع کمالات بلکہ متضاد صفات کی حامل ہو کر منصۂ شہود پر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ استعداد باطنی موروثی وخاندانی اثرات، گرد وپیش کے حالات اور ماحول وفضا کا اثر یہ ہوا کہ مولانا نے اپنے اندر وہ علمی وعملی کمالات اور وہ اوصاف حمیدہ جمع کر لیے جو آپ ہی کا حصہ ہیں۔

آپ کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب ندوی بی، ایس، سی- ایم،

---

(۱) حیات عبد الحی، ص:۵۴

بی بی، ایس، سابق ناظم ندوۃ العلماء جن کو ایک عرصہ تک آپ کے خارجی وداخلی حالات کے دیکھنے کا موقع ملا، "صاحب البيت أدرى بما فيه" گھر والا گھر کی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔

ایک واقف کار فرد ہونے کے ساتھ ساتھ قوت مشاہدہ رکھنے والے کی حیثیت سے انہوں نے جو کچھ ان کے بارے میں تحریر کیا ہے اس سے ان کے جامع کمالات ہونے کا اندازہ ہوتا ہے، وہ ترجمہ مصنف یادایام میں تحریر فرماتے ہیں:

"آپ نہایت حلیم متین، صابر، متوکل، خلوت پسند، سخی، حق گو، راست باز، آزاد خیال، راضی برضائے حق، محبّ ملک وقوم، ہمدرد بنی آدم، رقیق القلب، کریم النفس، بزرگ نمود ونمائش سے آپ کو سخت نفرت تھی، کسی کو نقصان پہنچانا یا کسی کا دل دکھانا آپ کے مذہب میں کفر تھا، خود تو کیا اگر کسی کے متعلق سن لیا تو اس سے نفرت ہوجاتی، آپ نہایت متقی تھے، مال حرام سے خدا نے عمر بھر آپ کو بچایا، معاملات میں سختی سے شرع کی پابندی کرتے، آپ نے سودی قرض کبھی نہیں لیا، نہ مشتبہ مال کھایا، مل کر کام کرنے کی قابلیت، جو آج کل مسلمانوں میں مفقود ہے، آپ میں ایسی پائی جاتی تھی کہ ندوہ کے ارکان ومعتمدین سب آپ پر اعتماد رکھتے تھے، اور کسی کو کوئی شکایت آپ سے نہیں تھی، تعاون کی حالت میں دو زریں اصولوں پر ہمیشہ آپ کا عمل رہا"۔

۱- دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنا اور ان کے اختیارات میں دخل نہ دینا۔

۲- اپنے اختیارات کے حدود پر بھی دوسرے معتمدین وارکان کونسل نظامت سے مشورہ لینا، آپ کا حافظہ کمزور تھا، مگر نہایت ذہین تھے، ذکاوت وفراست کا یہ حال تھا کہ آپ کے مخالف آپ کی فراست سے ڈرتے رہتے تھے، دوراندیشی اور معاملہ فہمی میں اپنی نظیر آپ تھے، طبیعت اس قدر سلیم تھی کہ ہر چیز کی اہمیت اس کے اس تناسب

سے سمجھتے جس تناسب کو فطرت نے قائم کردیا ہے، تدبر و عقل سے بہرہ وافر پایا تھا، آپ اردو، فارسی اور عربی ادب میں پایہ بلند رکھتے تھے مگر شباب کے ساتھ شعر گوئی کو بھی جواب دے دیا تھا، سخن فہمی میں جو درجہ آپ کو نصیب ہوا تھا وہ کسی کو ملا ہوگا، ادب کے علاوہ آپ کو تاریخ سے بھی خاص لگاؤ تھا۔

اور آپ اسلامی، ہندی، تاریخ میں بلند ترین پایہ رکھتے تھے، اور اس شعبہ کے امام اور دنیا میں اس شعبہ کے سب سے بڑے عالم تھے، قرآن وحدیث سے بھی آپ کو بہت ذوق تھا، اور آخر عمر میں حدیث کی مزاولت اتنی بڑھ گئی تھی کہ تاریخ کا مذاق بھی ماند پڑ گیا تھا۔

مولانا سید عبدالحی صاحب کے دوسرے نامور اور قابل فخر صاجزادے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے والد کے حالات تفصیل سے حیات عبدالحی میں تحریر فرمائے ہیں، وہ مولانا کی زندگی اور شخصیت میں آبائی وموروثی اثرات کے ذیلی عنوان کے تحت رقم طراز ہیں:

’’مولانا کے خاندانی بزرگوں اور والد ماجد کے جو حالات درج کئے گئے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر مولانا کی سیرت وشخصیت اور ان کے مختلف اور بعض اوقات متضاد اوصاف وکمالات اور مزاجی خصوصیات کا سمجھنا دشوار نہیں، قدیم ماحول خالص دینی تعلیم اور دولت باطنی کے ساتھ ادب وانشاء اور شعر وشاعری کا اعلیٰ مذاق اور نقد وسخن کا ملکہ راسخ، تاریخ وسوانح کی طرف خصوصی توجہ، طبقات علماء اور مراتب رجال سے خصوصی مناسبت اور گہری واقفیت، مکمل یکسوئی اور باطنی مشغولیت کے ساتھ دین وملت کی خدمت کا جذبہ اور اجتماعی کاموں کا ذوق اور صلاحیت، مطالعہ اور تصنیف کی محویت اور استغراق کے ساتھ ایک بڑی دینی تحریک اور ادارے انجمن ندوۃ العلماء (دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی ذمہ داری اور علمی سربراہی اور اسلام کی سربلندی کا جذبہ۔

والد مرحوم کی صفات میں سے دولت دنیا کی حقارت، زہد وقناعت کی عادت، کم آمیزی، خلوت پسندی، جاہ طلبی اور شہرت ونمائش سے تنفر اظہار کمال اور اپنے علمی کاموں اور کارناموں کے ذکر وتشہیر سے گریز، کم سخنی اور میدانی وعمومی سرگرمیوں کے مقابلہ میں خاموش خدمات اور ٹھوس کاموں کو ترجیح دینا، زندگی کے ہر ہر لمحہ کی قدر کرنا اور اس کو مفید ونتیجہ خیز باقی رہنے والے کاموں میں صرف کرنا، اسلاف کے کارناموں اور ان کی باقیات صالحات کی حفاظت اور ان کے نام نیک کو باقی رکھنے کا جذبہ، ان کی سرشت اور عادت ثانیہ بن گئی تھی اور ان سب اثرات وعناصر سے ان کی شخصیت وسیرت کی تشکیل ہوئی، اس کی تصدیق علامہ شبلی نعمانیؒ کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے مولانا عبد الحیؒ کو ندوہ کے دور انتشار کے دوران تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''باوجود تمام معائب کے جو مجھ میں موجود ہیں، یہ غالباً آپ جانتے ہوں گے، میں دنیا سازی نہیں جانتا اور جھوٹی خوشامد نہیں کرتا، اس لیے جو کہوں گا سچ کہوں گا، میں آپ کی جو وقعت کرتا ہوں بخدا آپ اس سے واقف نہیں، آپ کے علوئے نسب، مذہبی زندگی، ایثار نفس، محاسن اخلاق کا میرے اوپر جو اثر ہے، اس کے لحاظ سے میں اپنے آپ کو آپ کا ایک خادم سمجھتا ہوں۔'' (۱)

اس مجموعہ کمالات، جامع صفات، مختلف بلکہ متضاد اوصاف کی حامل شخصیت کے معترف ومداح، وہ سارے ہی حضرات تھے جن کو آپ کے ساتھ کام کرنے یا آپ کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملا، خاص طور سے وہ ارکان ندوۃ العلماء اور بہی خواہان تحریک جن کو بار بار آپ کی کتاب زندگی پڑھنے، آپ کی خداداد مزاجی خصوصیات سمجھنے اور علمی کمالات دیکھنے کا موقع ملا، وہ اتنے ہی زیادہ آپ کے مداح، آپ کی صلاحیتوں کے معترف اور آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے، ''انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے

(۱) حیات عبد الحی، ص:۱۷۹

کہ اس کے گھر والے، اس کے احباب اور اس سے استفادہ کرنے والے اس کے مداح اور قائل ہوں، اور یہ خوبی مولانا حکیم سید عبدالحی میں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی، ان اوصاف وکمالات میں سے چند امتیازی خصوصیات کو پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اعتدال وتوازن

اعتدال وتوازن، عدل وانصاف یہ اوصاف ان اعلیٰ انسانی قدروں میں ہمیشہ شمار کیے جاتے رہے ہیں جن پر یہ کارخانہ عالم قائم اور انسانی معاشرہ استوار رہا ہے، لیکن یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ انسان نے ہمیشہ اعتدال وانصاف کی ڈگر سے ہٹ کر ہی اپنا راستہ بنانے کی کوشش کی ہے، جس کے نتیجہ میں ظلم وزیادتی، ناہمواری اور انارکی وپراگندگی کا دور دورہ رہا، چاہے اس کی انفرادی شکل رہی ہو یا اجتماعی، عالمی سطح پر ہو یا علاقائی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کے مزاج میں یہ اوصاف اس طرح پیدا فرما دیئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ اسی پر ڈھل گیا ہے، بقول ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ''طبیعت ایسی سلیم تھی کہ ہر چیز کی اہمیت اس کے اس تناسب سے سمجھتے جس تناسب فطرت نے قائم کر دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ آپ کی زندگی کا ہر پہلو اس کا غماز نظر آتا ہے، اور اس کی جلوہ گری ان شعبوں میں بھی پورے آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے، جہاں بڑے بڑوں کے قدم لغزش اور ہمت والوں کی ہمت بھی جواب دے جاتی ہے۔

خانگی زندگی میں اعتدال

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ خانگی زندگی کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

''کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم وفاضل، مصنف ومفکر، سیاسی رہنما یا دین وملت کا خادم اسلامی نقطہ نظر سے اس کی عائلی ومعاشرتی زندگی اس کے اپنے اہل وعیال اور گھر والوں کے ساتھ اخلاق وتعلقات اس کے متعلق ان کا تاثر اور شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور خواہ کوئی شخص اپنے

اجتماعی وعلمی مقاصد کی تکمیل میں کتنا ہی انہماک اور تصنیف ومطالعہ میں کتنا ہی استغراق رکھتا ہو، اس کی ذاتی اور گھریلو زندگی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں بلکہ درحقیقت اس کے کامل انسان اور مثالی مسلمان ہونے کا معیار ومیزان ہے، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ (تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم میں سب سے بہتر ہوں)

پھر ملی واجتماعی خدمت میں شدید مشغولیت، گوناگوں ذمہ داریوں، عشق واستغراق تک پہنچے ہوئے ذوق مطالعہ وتصنیف کے ساتھ ساتھ خانگی زندگی کے جھمیلوں اور نزاکتوں کو خوشگواری کے ساتھ نبھانا، اہل وعیال کے نہ صرف حقوق ادا کرنا اور ضوابط کی پابندی کرنا، بلکہ ان کے ساتھ جذباتی لگاؤ، انس ومحبت اور ان کی رعایت ودلجوئی ایک ایسی شخصیت کے لیے جس کو فنا فی العلم وفی التصنیف کا خطاب دینا بے جا نہ ہوگا، اعلیٰ درجہ کے توازن اور اعتدال کی دلیل اور اس ذات قدسی کا پرتو ہے جس کی زبان نے دنیا سے **رفقا بالقواریر** کے الفاظ سنے اور جو اپنی نماز کو جس سے زیادہ محبوب شئی اس کے نزدیک کوئی اور چیز نہیں تھی کسی بچے کی آواز سن کر مختصر کر دیا کرتا تھا کہ شاید اس کی ماں جماعت میں ہو اور اس کی طبیعت بچہ کے رونے سے پریشان ہو رہی ہو، مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کے عائلی اور داخلی زندگی اس نور سے منور تھی، وہ باہر کی دنیا کے لیے ایک عظیم مصنف وعالم تھے، ندوۃ العلماء کے حلقہ کے لیے ایک ملی کارکن اور کامیاب ناظم تھے، اہل شہر کے لیے ایک حاذق طبیب اور کامیاب معالج تھے، اہل محلّہ کے لیے ایک دینی پیشوا اور بابرکت ہستی تھے، لیکن گھر والوں کے لیے ایک سرپرست خاندان، ایک رقیق القلب اور پرمحبت انسان،

ایک شفیق باپ اور ناز بردار مربی تھے، اور آپ کی خانگی زندگی ہر حیثیت سے پر مسرت وخوشگوار اور پر سکون وباوقار تھی"۔(۱)

آپ کے بڑے صاحبزادے جن کو آپ کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا، وہ لکھتے ہیں: وہ لکھنؤ میں اپنے والدین کے مطیع وفرمانبردار، اہل وعیال پر شفیق، جو اعزاء واحباب ضرورت مندر ہتے ان کے ساتھ اچھا سلوک اور صلہ رحمی، برادری کے حقوق ادا کرنے کا آپ کو بہت خیال رہتا تھا، تمام خاندان میں آپ اس امر میں ممتاز تھے۔(۲)

اسی جذبہ نے انجمن آل ہاشم کی بنیاد ڈلوائی اور وہ مؤثر مضمون لکھوایا جو بعد میں بھی اصلاح کے نام سے بارہا ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر ہر خاص وعام کے ہاتھوں پہنچ چکا ہے۔

علمی وتصنیفی زندگی میں اعتدال

تمام ظاہری وباطنی کمالات کے ساتھ علمی وتصنیفی زندگی میں جو تنوع وجامعیت اور مزاج میں جو اعتدال ومیانہ روی نظر آتی ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے، ایک طرف وہ علوم معقول ومنقول کے جامع ومحدث وفقیہ دوسری طرف مؤرخ وادیب اور نقاد وسخن شناس، ایک طرف ان کے قلم سے حدیث میں تلخیص الاخبار اور اس کی شرح منتہی الافکار اور کتاب الغناء نکلتی ہے، تو دوسری طرف تراجم وتاریخ میں وہ نزہۃ الخواطر اور "الثقافة الاسلامية في الهند" اور اس کے ساتھ اردو شعر وشاعری کی تاریخ پر تذکرہ "گل رعنا" جیسی کتابوں کے مصنف ہیں۔

گل رعنا کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں انہیں ممکن ہے کہ اس کا علم ہو ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان وادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

---

(۱) حیات عبدالحی، ص: ۲۱۰ (۲) یادایام، ص: ۱۸

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ورثاً ملا ہے، جو اردو فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ انہوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے، ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے جس سے فاضل مصنف کی وسعت نظری کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ یہ زبان وشعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا ہے، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رویے کا اظہار کیا گیا ہے۔(۱)

حکیم مختار اصلاحی صاحب آب حیات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات ادبی چٹخارے کی وجہ سے بار بار پڑھا اور انشاء پردازی کی داد دی، لیکن یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ انہوں نے بعض شعراء کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا، حکیم مومن اور کئی اہم شعراء کو وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے، لیکن جب گل رعنا کا مطالعہ کیا، تو محسوس ہوا کہ حق بحق دار رسید''۔(۲)

گل رعنا لکھنے کی ضرورت اس کی افادیت، اہمیت پر حیات عبدالحی میں تفصیلی تبصرہ موجود ہے، جس سے مولانا کی سلامت روی، اعتدال پسندی اور انصاف پروری کا کھلا ثبوت ملتا ہے۔

مولانا کی یہ صفت ہر کتاب میں اس طرح نمایاں اور ممتاز ہے کہ پڑھنے والا بغیر اعتراف کئے آگے نہیں بڑھ سکتا، نزهة الخواطر جو مصنف کا ایک عظیم علمی کارنامہ ہے اور طبقات ورجال ہند پر ایسا جامع اور وسیع تذکرہ ہے، جس کو ہندوستان ہی نہیں کوئی دوسرا ملک پیش نہیں کرسکتا، اس میں جس فیاضی، فراخ دلی اور انصاف پسندی سے کام لیا ہے کہ جس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کا مطالعہ وسیع وعمیق اور نظر گہری اور دور بین ہے، انہوں نے اس میں تمام مذاہب کے پیرؤوں، اہل حدیث حتی کہ فرقہ امامیہ کے علماء اور اہل فضل کو بھی لیا اور صاحب ترجمہ کے مخصوص عقیدہ، فرقہ اور اس کے

---

(۱) رسالہ اردو، جولائی: ۱۹۲۵ (۲) اطباء اور ان کی مسیحائی، ص: ۱۹۴

انحراف وشذوذ کا ذکر کرنے کے ساتھ اس کے علمی وذہنی کمالات کا دریا دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے، جس کا اندازہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی یا جن کے ایسے فکری، مسلکی اختلافات تھے-جنہوں نے ندوۃ العلماء کی تحریک کی پرزور مخالفت کی اور اس کی زندگی مشکل کر دی-ان کے ترجمہ سے اور اہل حدیث حضرات کے تراجم سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا نے ان تراجم پر کیسی فراخ دلی وانصاف پسندی سے کام لیا ہے۔

اسی طرح مولانا کی دوسری اہم تصنیف "الثقافة الاسلامية فى الهند" کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے حیات عبدالحی کے مصنف نے لکھا ہے:

"اس کتاب میں بھی نزہۃ الخواطر کی طرح مصنف کی سلامت روی، اعتدال وتوازن اور فراخ دلی کے جا بجا نمونے نظر آتے ہیں، تقلید وعدم تقلید، عمل بالحدیث اور تطبیق فقہ وحدیث کے بارے میں ہندوستان کے علماء کے جو گروہ بن گئے ہیں اور اس پر جو نقطہ اعتدال ہے ان کا تذکرہ کرتے وقت مصنف اور کتاب کا یہ وصف پورے طور پر نمایاں ہوا ہے۔" (۱)

مخالفین اور اعتدال

مخالفین کا جواب دینے اور انحراف کے شکار گروہ کی تفہیم کے لیے جو طرز عام طور سے اختیار کیا جاتا ہے، مولانا موصوف نے اس سے ہٹ کر نہایت شائستہ اور مہذب انداز اختیار کیا، نہ اس میں جھنجھلاہٹ اور تلخ کلامی کا کوئی شائبہ، نہ خیالی آرائی اور رنگ آمیزی جس کا گواہ سرسید کے نام مولانا کا وہ خط ہے جو طالب علمی کے آخری دور میں سرسید کو ان کے انتقال کے تین سال قبل تحریر کیا ہے، اس سب سے بڑھ کر مولانا کے اعتدال وتوازن کا مشاہدہ اس وقت کیا گیا جب ارکان ندوۃ العلماء اور منتظمین میں انتشار کی کیفیت رونما ہوئی اور پھر جس نے طوفان کی شکل اختیار کر لی اور ملک کی پوری فضا پر چھا گئی، ایسے ماحول میں اگر کوئی قابل اعتماد ومتفق علیہ شخصیت تھی تو وہ مولانا کی شخصیت تھی۔(۲)

---

(۱) حیات عبدالحی، ص: ۲۹۹ (۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (تاریخ ندوۃ العلماء)

استقامت واستقلال

آج کل جن کمالات انسانی، اور اوصاف بشری میں نمایاں کمی آئی ہے جس کو ہر جگہ اس کمی کا رونا رویا جارہا ہے، وہ ثابت قدمی، استقلال اور استقامت ہے، ذاتی اعتراض اور معمولی مقاصد کے لیے انسان نے اپنے اوصاف حسنہ اور کمالات کا سودا کرلیا ہے، اور اس بے کمالی وخودغرضی کو سب سے بڑا کمال سمجھ لیا ہے، مولانا کو اس سے بھی حصہ وافر ملا تھا، سوچ سمجھ کر راہ کا تعین، پھر پوری ہمت وطاقت سے اس پر جمنا، ہزار طوفان اٹھیں، آندھیاں آئیں، لیکن اپنی جگہ سنگ میل کی طرح ثابت رہنا مولانا کی وفات پر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے فروری ۱۹۲۳ء کے معارف میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا وہ لکھتے ہیں:

"مولانا سید محمد علی صاحب ناظم تھے، ان کی نگاہ انتخاب فوراً اس جوہر قابل پر پڑی، وہ دن ہے اور ان کی وفات کا دن ہے کہ ندوہ ان کی خدمات سے کبھی محروم نہ رہا، ندوہ پر کیا کیا انقلابات رونما ہوئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے، اور کتنے چلے گئے، کتنے معتمد وناظم عزل ونصب ہوئے، کتنے حوادث وفتنے پیدا ہوئے مگر ان تمام حالات کے طوفان میں ثبات واستقلال کی صرف ایک چٹان تھی جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کی ذات تھی"۔

ان کے نامور قابل فخر صاحبزادے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حیات عبد الحی میں ان کا ندوہ سے تعلق اور اس سے وابستگی بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"بہرحال مولانا سید عبدالحی صاحب ۱۳۱۱ھ، ۱۸۹۲ء سے لے کر ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء تک ربع صدی سے زائد مختلف حیثیتوں سے ندوۃ العلماء سے وابستہ اور سرد وگرم، عسر ویسر، تنزل وترقی اور انتشار ویکجہتی میں یکساں طور پر اس کے ہم سفر ودم ساز رہے۔ اور کسی دور میں بھی آپ کے اپنے ثبات میں

لغزش اور استقلال، طبیعت میں فرق نہ آیا، ندوۃ العلماء کے دائروں کے اندر اور ہندوستان کے وسیع رقبہ میں بھی بڑے بڑے سیاسی طوفان آئے، بڑے بڑے انقلابات اور آزمائشوں سے اس تحریک وادارہ اور پورے ملک کو گزرنا پڑا، لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم رہے، اور اپنے لیے خدمات کا جو راستہ عنفوان شباب میں تجویز کیا تھا، اس پر دم واپسیں تک ثابت قدم رہے"۔(۱)

اسی طرح ان کے رفیق خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے ان کی وفات کے بعد ندوہ کے پہلے جلسہ سالانہ منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی اور وہ اسٹیج پر آئے اور ان کی نگاہیں اپنے دیرینہ رفیق وحبیب، جن کو ہمیشہ دیکھنے کی عادت تھی، نہ دیکھ سکیں تو ان کی تسلی کے لیے انہوں نے زبان کا سہارا لیا اور مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

حضرات! جب کہ میں اس مجمع عظیم پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو میری نیاز اگیر آنکھیں اس چہرہ کو ڈھونڈتی ہیں جو جمال وکمال کے نور سے ہمارے دلوں کو ایک ثلث صدی تک منور کرتا رہا، جمال میں حسب ونسب کا نور تھا، کمال میں علم وعمل کا، میری مراد مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء سے ہے، کسی مقصد عالی کے حصول میں مخلصانہ اتحاد وعمل دلوں میں وہ رابطہ وتعلق پیدا کر دیتا ہے جس کو موت بھی فنا نہیں کر سکتی، یہی ربط ہے جو ہماری نگاہوں کو اس پاکیزہ صورت کی تلاش میں ہر طرف لے جاتا ہے، آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر ان کے حسن عمل کا نور ندوۃ العلماء کے در ودیوار سے تاباں ہے، اور فضل ربانی شامل حال ہے تو صدیوں تک رہے گا، سید صاحب مرحوم کی مردم شناسی، معاملہ فہمی، علمی خدمات اور اخلاص عمل وہ صفات ہیں جو اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔ "رحمه الله تعالیٰ وجزاه عنا وعن سائر المسلمين خير الجزاء"(۲)

مولانا کے حسن نیت، جذبہ خدمت، خلوص وللّٰہیت اور نواب صدر جنگ صاحب کی تمنائے صادق اور دعائے پر اثر کا نتیجہ مولانا کے دو فرزندوں کی شکل میں نکلا، جو آفتاب ومہتاب بن کر چمکے، ان کے حسن عمل کا نور ندوۃ العلماء کے در ودیوار سے تاباں ہے، اور ایسا

(۱) حیات عبدالحی، ص:۲۷ (۲) روداد اجلاس دوازدہم ندوۃ العلماء بمقام لکھنؤ، ص:۳۰

فضل ربانی شامل ہے کہ اس کی ضیا پاشی پورے عالم اسلام پر ہو رہی ہے اور آج مشرق ومغرب میں اس کی صدا سنی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اس گہوارۂ علم وفضل، منبع معرفت وآگہی اور سرچشمۂ علوم نبوت کو صدیوں آباد رکھے، اور یہ مرکز برابر رشد وہدایت کا مرکز رہے۔

علمی وادبی اور تاریخی امتیاز وخصوصیت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا ان تمام مزاجی واخلاقی اور روحانی اوصاف کے وارث اور علمی وادبی اور تاریخی ذوق کے حامل وامین تھے، جو خاندانی والا شان کا وصف امتیازی اور عرصہ دراز سے اس کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے، اور نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا آرہا ہے، ہندوستان کے نامور مؤرخ اور ممتاز صاحب قلم پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے رسالہ ''تحریک اصلاح وجہاد'' کی ابتدائی سطروں نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ''ایک مدت سے راقم کو رائے بریلی حاضری کی تمنا تھی کہ اس فضا میں کچھ دیر سانس لینے کی سعادت میسر آجائے، جہاں حکمت ولی اللّٰہی اور سوز علم اللّٰہی نے مل کر نیا پیکر اختیار کیا ہے، اور جہاں سرفروشی وجانبازی کی تاریخ لکھی گئی، رائے بریلی کو قدرت نے امتیازی خصوصیات سے نوازا ہے، صدیوں سے علم وارشاد کا گہوارہ، شریعت وسنت نبوی کا مرکز اور دعوت وعزیمت کا منبع ہے، جس فیض کی ابتداء شاہ علم اللہ کی نوائے سحری، سید احمد شہید کے ذوق شہادت اور مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے تبحر علمی سے ہوئی تھی، وہ آج مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ذات گرامی میں ایک نئی قوت بن کر نمودار ہوا ہے۔'' (۱)

حکیم سید فخر الدین خیالی ''حیات اور کارنامے'' کے مقدمہ میں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

> ''دعوت وعزیمت، ارشاد وتلقین، علم وفضل، سلوک وعرفان، سخن وری اور سخن شناسی کا شاید ہی کسی خاندان میں وہ اجتماع ہوا ہو جو رائے بریلی کے دائرۂ شاہ علم اللہ میں بسنے والے خانوادہ کو قسام ازل نے

(۲) تحریک اصلاح وجہاد، ص: ۸

ارزانی سے فرمایا اور جو آج تک اس خاندان کا طرۂ امتیاز ہے‘‘۔(۱)

اردو اکیڈمی دہلی کی تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی نے مولانا عبدالحی صاحب کی کتاب ’’دہلی اور اس کے اطراف‘‘ کی ترتیب وتدوین صادقہ ذکی صاحبہ کو سونپی، جنہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ خدمت انجام دی اور ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا، جس میں مصنف کے علمی وادبی اور تاریخی کارناموں کو سراہا اور ان کی تصنیفات کا مختصر مگر ٹھوس جائزہ پیش کیا، وہ اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں:

’’دہلی اور اس کے اطراف کے مصنف مولانا سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء اواخر انیسویں کی ایسی علمی وادبی شخصیت ہیں کہ جن کے علمی وادبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔‘‘(۲)

آگے تحریر فرماتی ہیں:

’’کتب بینی اور تصنیف وتالیف آپ کے مشاغل رہے، ان مشاغل میں شہرت پسندی کو دخل نہ تھا، بلکہ یہ مشاغل ان کی طبیعت کا تقاضہ تھے، اردو فارسی اور عربی زبانوں پر انہیں قدرت حاصل تھی، آپ نے اردو میں جو کچھ لکھا وہ قابل قدر ہے، لیکن عربی وفارسی میں آپ نے بڑے پایہ کے علمی تحقیق انجام دی، نـزهة الـخـواطر عربی میں ہے جس میں پانچ ہزار اعیان ہندوستان کا تذکرہ ہے، حکیم عبدالحی کو اسلامی عہد کی تاریخ سے خصوصی دلچسپی رہی، آپ نے جس علمی ماحول میں تربیت پائی اور جس انداز سے علوم کا اکتساب کیا اور جس طرح ایک دینی وعلمی ادارہ کی رہنمائی کی، غالباً اس متواتر فضا کا تقاضہ تھا کہ آپ اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالیں، چنانچہ تاریخ وتمدن، تاریخ ملوک، تاریخ علوم وفنون، تاریخ سلاسل وتصوف اور خاندانی وانساب جیسے موضوعات کو انہوں نے مرتب کیا، عبدالحی صاحب کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تن تنہا بڑے بڑے کام انجام

(۱) مقدمہ سوانح خیالی، ص:۱-۲ (۲) ایضاً: ص:۲۶

دیتے تھے، اس نوعیت کے کام ادارے پروجکٹ کی شکل میں انجام دے پاتے ہیں، ان کی ایک اور کتاب "جنۃ المشرق" ہندوستان کے اسلامی عہد کا ایک چھوٹا سا انسائیکلوپیڈیا ہے جو حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے اور ''معارف العوارف'' ہندوستان میں علم وتعلیم کی تاریخ اور ہزار سالہ اسلامی عہد کے مصنفین اور تصنیفات کی ڈائرکٹری ہے، جو ہندوستان کے متعلق مستند معلومات کا بہترین ماخذ اور ذخیرہ ہے اور عالم اسلام کو ہندوستان کی علمی اور دینی خدمات سے واقف کرانے کا ایک ذریعہ ہے، اسے دمشق کی مشہور اکادمی نے شائع بھی کیا ہے، اردو میں یاد ایام (تاریخ گجرات) گل رعنا، دہلی اور اس کے اطراف، قابل ذکر کتابیں ہیں، انہوں نے تاریخی موضوعات پر اردو میں مضامین بھی لکھے ہیں، مولانا حکیم عبدالحی صاحب کے علمی کاموں کی اچھی خاصی تعداد غیر مطبوعہ ہے۔(۱)

ان کی تبحر علمی کی گواہ ان کی وہ تصنیفات ہیں جو علمی دینی اور تاریخی وادبی دنیا میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، اپنے زمانہ کے ممتاز اہل قلم اور اصحاب ذوق اس کی داد دے چکے ہیں۔

نامور صاحب قلم ادیب وسیرت نگار رسول، عالم بے بدل حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبدالحی کی بے نظیر کتاب "نزھۃ الخواطر" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اسلامی ہندوستان کے پورے ہزار سالہ عہد میں شعراء ومشائخ وسلاطین کے سینکڑوں تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں، لیکن آزاد بلگرامی کی تصنیفات کو چھوڑ کر کوئی مختصر رسالہ بھی مستقل یہاں کے علماء وفضلاء کے حالات میں نہیں لکھا گیا، مولانا سید عبدالحی مرحوم نے اس نقص کو محسوس کیا اور پورے بیس برس اس کام پر انہوں نے صرف کیئے، اس عرصہ میں

(۱) ایضاً: ص: ۲۸-۲۹

ہندوستان کی اس سرحد سے اس سرحد تک کوئی کتب خانہ نہیں چھوڑا جہاں ان کو ذوق طلب کھینچ کر نہ لے گیا ہو اور بالآخر آٹھ جلدوں میں علماء ہند کی پوری سوانح عمریاں جمع کیں، اس کا مقدمہ لکھا، جس میں ہندوستان کے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ مرتب کی، عربی میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ، سلاطین اسلام، یہاں کے اسلامی تمدن، مساجد، مدارس، عمارات، شفاخانے اور دیگر خصوصیات پر ایک پوری کتاب تیار کی''۔(۱)

ممتاز اہل قلم مولانا معین الدین احمد ندوی، مولانا عبدالحی صاحب کی کتاب ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' کے پیش لفظ میں ان کے علمی خدمات، وسعت نظر، ذوق کا تنوع اور جامعیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کی نظر ہندوستانی مسلمانوں کی پوری علمی تاریخ پر ہو، علماء میں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی نظر اس پر بڑی گہری اور وسیع تھی، جس پر ان کی عربی تحریر نزہۃ الخواطر کی ضخیم جلدیں شاہد ہیں، ان کے ذوق میں عجیب تنوع تھا، ایک طرف انہوں نے نزہۃ الخواطر جیسی بلند پایہ علمی کتاب لکھی، جو تراجم کی قدیم بنیادی کتابوں میں ہے، دوسری طرف گل رعنا لکھی جو اردو شعر وادب کی بنیادی کتابوں میں ہے۔(۲)

حکیم محمد مختار اصلاحی اپنی کتاب میں مولانا کی تعلیمی انہماک اور علمی جد وجہد کو نتیجہ خیز اور بامعنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محبت ومشقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ بہت جلد ان کو اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ادب پر پوری قدرت اور فن طب میں پوری مہارت حاصل ہوگئی، تاریخ سے بھی انہیں دلچسپی تھی، ان کی کتاب نزہۃ الخواطر اپنا جواب نہیں رکھتی، شعر وشاعری اور سخن فہمی کا ذوق بھی بہت اچھا اور

---

(۱) معارف: ۱۹۲۳ء (۲) اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، ص:۱

پاکیزہ تھا، شعرائے اردو کے تذکرے میں ان کی کتاب گل رعنا ایک معیاری کتاب ہے"۔(۱)

مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات ایک جامع ترین انتخاب اور زبان وادب کے لحاظ سے ایک معیاری کتاب سمجھی جاتی ہے، انشاء پردازی دقیق نکتہ سنجی بلکہ ذوق آفرینی میں اس کا جواب نہیں، لیکن علم وتحقیق میں کسی کو حرف آخر قرار دینا مشکل ہے، مولانا حکیم عبدالحی صاحب جیسے وسیع النظر مؤرخ، سخن شناس ادیب کی جب اس پر نظر پڑی تو ان کو اس کے بعض گوشے نظر آئے، شعراء کا اس میں بہت احاطہ کیا گیا ہے، لیکن ایک تعداد ایسی ہے جو قلم انداز ہوگئی ہے یا اپنا حق نہ پاسکی ہے، اسی طرح بعض ایسے بیانات پائے جاتے ہیں جن کی تصدیق ایک دقیق وسیع نظر رکھنے والا مؤرخ وادیب نہیں کرسکتا، اس ضرورت کی تکمیل مولانا نے گل رعنا لکھ کر کی، جس کا اعتراف خود اردو دنیا کے معروف ومشہور ناقد ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مصنف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے اگرچہ زبان وشعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا ہے، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔(۲)

آپ کی اردو تحریر میں متانت وحلاوت کی لطیف آمیزش اور علمی سنجیدگی کے ساتھ زبان کی چاشنی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے، خصوصاً تاریخی مضامین میں بڑی لطافت اور ادبی حلاوت جس کا نمونہ ان کی تصنیف لطیف یادایام، گل رعنا کے حواشی ہیں، جہاں تک سخن شناسی کا تعلق ہے اس میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا، اپنے زمانہ کے مؤرخ وادیب اور مولانا علیہ الرحمہ کے صدیق صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی نے اپنی ایک غزل آپ کی خدمت میں بھیجی، آپ نے از راہ تواضع اپنی تحسین کو تحسین ناشناس سے تعبیر کیا، اس پر نواب صاحب نے مندرجہ ذیل سطور لکھ کر بھیجیں۔

آپ سخن ناشناس ہیں تو سخن شناس کون ہوگا؟ صاحب ذوق سلیم جس کے دل میں

---

(۱) اطباء اور ان کی مسیحائی ص:۱۹۴ (۲) رسالہ اردو، جولائی ۱۹۲۵ء

درد کی چاشنی ہوتو ضرور شعروفہم ہوگا، ذوق نہ ہوتا تو قند پارسی کیوں کام بخش ہوتا، درد نہ ہوتا تو خاک جاناں کی حسرت دل میں کس طرح ہوتی، ذوق و ہمدردی، درازآہنگی کی سلسلہ جنبائی کرتا ہے، نوائے دل پر توجہ فرمایئے، کہ کس پردے سے اٹھ رہی ہے۔(۱)

جناب صادقہ ذکی صاحبہ مولانا کے ''دہلی اوراس کے اطراف'' کے سفرنامہ کے بارے میں اوراس کے واقعات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''واقعات کی یہ کاغذی تصویریں اس سفرنامہ کا خاصہ ہیں، ہرقسم کے مبالغہ سے بری بے تکلف انداز سیاح نے اپنی ڈائری کے اوراق میں یہ واقعات رقم کیے ہیں، سفرنامے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصنف جہاں کہیں جاتے ہیں، اس مقام اور شخصیات کے متعلق قیمتی معلومات قلمبند کرتے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا علمی جامعیت کا مالک ہے، اپنی تاریخ اوراپنے پورے دور سے پوری طرح باخبر ہے۔

سفرنامہ میں مرحومین کے کارناموں کی اہمیت تاریخی شہادتوں کے ساتھ بیان کیے ہیں یہ معلوماتی حصہ اس سفرنامہ کی اہم کڑی ہے۔

ہرقسم کے تکلف یا مبالغہ آرائی کے خلاف سادگی اور بے ساختگی اور اس کے ساتھ اختصار و جامعیت سفرنامے کی اہم خصوصیات ہیں، کسی دینی عالم کی تحریر میں عموماً سادگی وسلاست کا وصف اس لیے کم ہوتا ہے کہ عبارت میں علمی اصطلاحیں اور عربی فارسی کی ترکیب زیادہ ہوتی ہیں، لیکن حیرت ہے کہ اس سفرنامہ کی عبارت میں یہ اصطلاحیں اس طرح رچی بسی ہیں کہ ان کے علیحدہ وجود کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح عربی وفارسی کے اشعار جیسی عبارت کا ضروری حصہ معلوم ہوتے ہیں، اردو میں سادہ نثر کی روایت شروع ۱۹رویں صدی سے ملتی ہے، موجودہ سفرنامہ بھی اردو اسالیب نثر کے ارتقاء کی ایک نئی کڑی معلوم ہوتی ہے''۔(۱)

---

(۱) حیات عبدالحی، ص: ۲۲۵ (۲) مقدمہ دہلی اور اس کے اطراف، از جناب صادقہ صاحبہ، ۲۲،۲۳،۲۵،۲۶۱

مولانا کا ذوق تاریخی ان کو کشاں کشاں کہاں تک لے جاتا ہے، جب بھی وہ کسی تاریخی مقام پر پہنچتے یا گزرتے ہیں، تو یہ ذوق ان کو کئی صدیوں کی سیر کرا دیتا ہے، کیسی کیسی باتیں، کیسے کیسے مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں، جو ان کو کبھی ہنساتے اور کبھی رلاتے ہیں، دہلی میں جو صدیوں مسلمانوں کا دارالسلطنت اور مرکز رشد وہدایت رہا، جب وہ اس سرزمین پر اترتے ہیں تو ان کے نہاں خانہ دل میں کیسی کیسی تصویریں ابھر آتی ہیں، حمیت اسلامی اور جذبہ دینی جوش مارنے لگتا اور جب دہلی سے رخصت ہوتے ہیں تو دامن صبر وقرار ان کے ساتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

ان کا رواں قلم دل کھول کر روتا ہے اس وقت ان کا زور قلم اور جوش تحریر اپنے نقطہ عروج پر پہنچ جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں: اے دلی! ہم تجھ سے رخصت ہوتے ہیں، اے مرقعہ عبرت! اے تازیانے غیرت! اے افسانہ حسرت! اے آئینہ حیرت! اے مسلمانوں کی گزشتہ اقبال مندیوں کے نمونے! اے لق ودق صحراء! اے مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوئے میدان! اے درحقیقت مسلمانوں کے خاک پاک! پرانا جاہ وجلال کہاں؟ وہ لوگ کہاں جو تیری زیب وزینت ہیں؟ قطب الدین ایبک کا تہور، شمس الدین التمش کی اولوالعزمی، غیاث الدین بلبن کی تدبیر، مسلمانوں کے ظفر واقبال کا نمونہ تھی، تو وہی دلی ہے جس کے خلجی وتغلق فرمانرواؤں کی سطوت تمام عالم میں ضرب المثل تھی، اے دلی! یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے، قوم کا مرثیہ ہے، اے ہماری شامت اعمال کی برباد شدہ دلی! کیا ہم پھر تیرا پچھلا جاہ وجلال دیکھ سکتے ہیں؟ ہم میں وہ فاروقی جلاوت، خالدی جرأت، قومی اتفاق، اسلامی جوش، انسانی ہمدردی اب کہاں آسکتی ہے؟ ان میں تہور تھا ہم میں جبن ہے، ان میں جرأت تھی ہم میں نامردی ہے، ان میں قومی اتفاق تھا ہم میں نفاق، وہ پرجوش تھے ہم خاموش، ان میں انسانی ہمدردی تھی ہم میں بے دردی، وہ دین ودنیا کو توأم سمجھتے تھے، ہم برہم، وہ غیور تھے ہم بے غیرت، ان میں فخر نہ تھا، ہم میں کبر ہے۔

فریب حسن سے گبرو مسلمان کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہم بگڑا

گجرات کی تاریخ لکھی تو وہاں کے شاہانی معدلت شعار، علمائے عالی وقار اور مشائخ کبار کی تصویر کھینچ دی، اور نہایت اختصار وجامعیت کے ساتھ ان کے حالات قلمبند کئے بقول صدر یار جنگ: آپ نے ماشاءاللہ خوب رسالہ لکھا ہے، بیان صاف دلکش مطالب محققانہ، مأخذ نادر اور صحیح۔(۱)

رسالہ کے اخیر میں اہل گجرات کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی غیرت کو للکارا ہے اور ان کی قسمت خفتہ بیدار کرنے کی کوشش ہے، لکھتے ہیں: مگر اے اہل گجرات! خدارا انصاف کیجئے، کیا اب بھی آپ کے ملک سے ایسے جوہر قابل نکلتے ہیں جو علامہ وجیہ الدین اور شیخ محمد طاہر محدث نہ سہی سید جلال رضوی اور قاضی عبدالوہاب کی یادگار سمجھے کے مستحق ہوں، آپ کہیں گے کہ اب اس کا زمانہ نہیں، نہیں ہے تو جانے دو، میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں کوئی دادا بھائی نوروجی اور مسٹر گاندھی کا جواب ہو، کہو نہیں۔

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی
بتاتا باغباں رو رو کے یہاں غنچہ یہاں گل تھا(۲)

عربی زبان وادب میں مہارت اور پایہ بلند رکھتے تھے جس کا اعتراف عرب اہل قلم نے دل کھول کر کیا ہے، عربی زبان وادب کے ان ناقدین نے آپ کی عربی زبان میں مہارت، اہل زبان کی سی حلاوت وسلاست تسلیم کی ہے۔

ڈاکٹر تقی الدین مراکشی اور علامہ بہجۃ الاثری نے (جو عالم عربی کے ان ممتاز اہل قلم اور ناقدین میں شمار کئے جاتے ہیں جن کی زبان وادب میں مہارت تسلیم کی جاتی تھی) نے مولانا عبدالحی کو ہندوستان کے ان علماء میں شمار کیا ہے جن کی عربی زبان

(۱) ایضاً: ص: ۳۸ (۲) تاریخ گجرات، ص: ۱۱۸

عجمی رکاکت سے پاک بلکہ اہل زبان کی سی ہے، کہ ایسی شگفتہ اور شستہ عربی لکھنے والے ہندوستانی تاریخ میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

عرب دنیا کے معروف اہل قلم ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے ڈاکٹر قدرت اللہ صاحب کی عربی کتاب (علامة عبد الحي حياته وخدماته) کے مقدمہ میں مولانا عبدالحی صاحب کی زبان وادب کو معیاری اور اعلیٰ قرار دیتے ہوئے ان عرب اہل قلم کو غیرت دلائی جو وہاں رہتے ہوئے بھی ایسی زبان نہیں استعمال کرتے، بلکہ علاقائی اور مبتذل الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں۔(۱)

الغرض مولانا کو قسام ازل نے جن اوصاف وکمالات سے نوازا تھا اور جن مکارم اخلاق ومحاسن اور خوبیوں سے زینت بخشی تھی، وہ ان کی تالیفات اور تحریروں میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ بعض پھل ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو جدھر سے بھی نوش کیا جائے وہ میٹھے اور رس بھرے ہوتے ہیں جو سراپا مغز ہوتے ہیں، پوست ہوتا نہیں، یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پوست ہوتا بھی ہے تو وہ ایسا ہم مذاق وہم رنگ مغز ہوجاتا ہے کہ شیرینی کو گھٹاتا نہیں ذائقہ کو کچھ اور لطیف تر کردیتا ہے۔

مولانا کی امور خانہ دیدہ وری، ادبی لطافت وشیرینی، شعر گوئی اور سخن شناسی، فقیہانہ بصیرت، محدثانہ نظر، اعتدال پسندی وسلامت روی، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی اپنے اور پرائیوں کے معاملہ میں عدل وانصاف، زندگی کے وہ نمایاں اور ممتاز پہلو ہیں جو ان کی تحریروں اور سوانح میں آسانی سے تلاش کئے جاسکتے ہیں، میں نے ان میں تین پہلوؤں پر قدرے روشنی ڈالی ہے کہ بازار میں یہ گرانقدر وقیمتی جنس نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، خریدار قیمت لگانے کو تیار تو ہوتے ہیں لیکن جنس ہی نایاب ہوتی جاتی ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے "مقدمة العلامة عبد الحي حياته وخدماته" للدكتور قدرة الله الحسيني، از ڈاکٹر عبدالحلیم عویس

حضرت سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہؒ

(والدہ ماجدہ مفکر اسلام)

ولادت

سید خیر النساء بہتر صاحبہ جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی والدہ صاحبہ ہیں، اور شیخ وقت حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی صاحبزادی ہیں۔

۱۳۰۵ھ میں پیدا ہوئیں، حضرت شاہ صاحبؒ کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت اور مناسبت انہیں سے تھی، فرماتیں ہیں کہ والد صاحب کے پاس جب کوئی اچھی کتاب آتی تو مجھے دیکھنے کو دیتے اور مجھ سے تذکرہ کرتے، یہی ان کی سب سے بڑی خاطر اور محبت کی نشانی تھی۔

آپ کے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا بہت مخصوص اور محدود پیمانہ پر رواج تھا، علماء حق کی کتابیں جو اس خاندان کے مسلک اور عقیدہ سے مطابقت رکھتی تھیں، وہ ایک طرح سے نصاب میں داخل تھیں، جن کتابوں کا وہ بار بار تذکرہ کرتی تھیں ان میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی کی کتاب ''مالا بدمنہ'' (عقائد مسائل) میں راہ نجات، حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی کتاب (آثار قیامت پر) چہل حدیث، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ قرآن۔

اس کے علاوہ اپنے چھوٹے ماموں سید عبید اللہ صاحبؒ (جو خود حافظ تھے اور

عمدہ قرآن پڑھتے تھے) تین سال میں حفظ قرآن پاک مکمل کرلیا۔

دعا سے شغف

آپ کو دعا سے خاص شغف و تعلق تھا، عموماً ان کی ساری زندگی دعا اور مناجات میں گزری، ماثور دعائیں، منظوم مناجاتیں، بیٹھے بیٹھے، سوتے جاگتے ہر فکر و تردد کے موقع پر پڑھتی تھیں، ان کا یہ شعر بالکل حسب حال اور ان کے اصل ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔ ؎

تیرا شیوہ کرم ہے اور میری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولا! تیرے در کے فقیروں کی

اور ان کے یہ اشعار ان کی اضطرابی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ؎

کون سی سرکار ہے جس کا ہے سب کو آسرا
کون سا دربار ہے جس میں ہے ہر کوئی کھڑا
کون سا وہ شاہ ہے جس کا ہے ہر کوئی گدا
کون سا در ہے نہ جس در سے کوئی خالی پھرا
آج اسی سرکار سے میں بھی تو پاکر شاد ہوں
آج اسی دربار سے میں بھی تو خوش ہوکر پھروں

اپنی ایک تصنیف میں دعا کی کیفیت یوں بیان کرتی ہیں:

”دعا گویا میری غذا تھی، بغیر دعا کئے مجھے سیری نہ ہوتی، دعا کی مشغولیت اتنی بڑھی کہ ان کی موزوں طبیعت اور جذب دل نے اس کو نظم کا قالب بھی عطا کیا، اور وہ اپنے دلی جذبات کو اشعار میں ادا کرکے اپنے دل کو تسکین دینے لگیں۔“

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ذرہ کو گر چاہے تو ہی پل میں کرے رشک قمر
تری صفت یہ دیکھ کر کیوں حوصلہ میرا ہو کم

نہ اٹھوں گی میں اس در سے کوئی مجھ کو اٹھا دیکھے
یہ شان دیکھی تری نرالی جو مانگے تجھ سے تو اس سے راضی
بلا کے دینا کرم ہے تیرا یہ فضل بھی ہے کمال بھی ہے

شادی

۱۹۰۴ء میں مولانا عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) سے نکاح ہو گیا، خود وہ تحریر کرتی ہیں: یہ گھر میرے لیے جنت اور یہ خدمت میرے لیے رحمت تھی، گویا میں سایۂ رحمت میں آ گئی نہ کوئی فکر کرتی اور نہ کوئی غم، ہر گھڑی شکر میں گزرنے لگے۔

کس زباں سے کروں میں شکر ادا　　تیرے انعام و لطف بے حد کا
تو نے مجھ کو کیا بنی آدم　　اشرف الخلق اکرم العالم

غرض یہ زمانہ ہر طرح سے فرحت و مسرت اور خیر و برکت کے ساتھ گزر رہا تھا، کہ اچانک ۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو مولانا عبدالحی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا، وہ خود اس واقعہ کے بارے میں تحریر کرتی ہیں کہ میں اپنے مالک حقیقی کی رضا پر راضی ہو گئی، مگر یہ غم جدائی ایسا نہ تھا کہ برداشت کر لیتی، یہ بھی اس کی رحمت اور حکمت تھی کہ جو مجھے اپنی خوشی پر راضی رکھا، ورنہ جو بھی حالت ہو جاتی کم تھی، ایسے مونس رفیق کا یک بیک نظر سے غائب ہو جانا قیامت سے کم نہ تھا، مگر درحقیقت یہ واقعہ میرے لیے ہلاکت و مصیبت نہیں بلکہ سراسر رحمت اور ذریعہ عنایت تھا کہ بجائے ہلاکت و بربادی کے مجھے اپنے سایہ رحمت میں لے لیا، اور میرا سچا مونس و غم خوار اور مددگار ہو کر ہر موقع پر ساتھ دینے لگا۔

سبحان اللہ کیا شان رحمت ہے اس کی، اٹھی غم کی گھٹا اور رحمت ہو کر برس گئی، جس سے تمام کھیتی سرسبز و شاداب ہو گئی۔

عبادت سے تعلق

اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ہمہ تن اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئیں،

گرمی میں ڈھائی بجے سے، جاڑوں میں تین بجے سے اور رمضان شریف میں گرمی میں ایک بجے سے اور جاڑوں میں ڈیڑھ بجے سے تہجد کے لیے اٹھ بیٹھتی تھیں، اور بڑی لمبی لمبی سورتیں پڑھتی تھیں، تہجد میں اس قدر روتی تھیں کہ آنسوؤں سے جانماز تر ہو جاتی تھی اور کبھی بھی اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے دنیا کی خواہش نہیں کی، بس اللہ اور رسول کی محبت، دینی خوبیاں اور دینی خدمت کی توفیق کی خواہش کی۔

صبح کی نماز پڑھ کر سب کو جگانا شروع کر دیتیں تھیں، جو اٹھنے میں تساہلی کرتا تو بہت ناراض ہوتیں اور جو نماز کے بعد سو جاتا تو اس پر خفا ہو جاتیں، کہتی تھیں جو ہمارے گھر میں سوئے وہ نماز کے لیے ضرور اٹھے، ورنہ یہاں نہ سوئے، تہجد کے بعد صبح کی نماز تک (لا الہ اللہ) کی ضرب لگاتی تھیں، پھر صبح کی نماز کے بعد تسبیحات میں مشغول ہو جاتی تھیں، اشراق کی نماز پڑھ کر ناشتہ سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کرتیں، اور کچھ گھر کے کام انجام دیتیں، پھر چاشت کی نماز کے بعد مناجاتیں لکھنا شروع کر دیتیں، پھر دوپہر کے کھانے کا وقت آجاتا، کھانا کھا کے کچھ دیر آرام کرتی تھیں، پھر اذان سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھ جاتیں اور جائے نماز پر بیٹھ کر تسبیحات میں مشغول ہو جاتیں جب ظہر کی اذان ہو جاتی تھی تو نماز پڑھ کر سورۂ فتح اور سورۂ نبأ پڑھتی تھیں، پھر تسبیح پڑھنا شروع کر دیتی تھیں، یہاں تک کہ عصر کا وقت آجاتا تھا، عصر کی نماز پڑھ کر پھر کلام پاک کی سورتیں مغرب تک پڑھتی رہتی تھیں، ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کا انتظار شروع ہو جاتا تھا۔

مخدومہ محترمہ کو خوابوں سے خاص مناسبت تھی، اچھے اور معنی خیز خواب دیکھتیں، اور تعبیر میں بھی پورا درک تھا، خود رسول اکرم ﷺ کی زیارت اور آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کے شرف وسعادت سے خواب میں بہرہ مند ہو چکی تھیں۔

اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک صاحبزادہ گرامی قدر مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ کے متعلق بھی بہت سے مبشرات خواب میں دیکھ چکی تھیں، جو باقاعدہ انہوں نے تحریر بھی کر لیے تھے۔

نصائح

ان کا ایسا دینی ذہن بن چکا تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو وقتاً فوقتاً جو خطوط ارسال کئے ان سے اس کی پوری عکاسی ہوتی ہے، ایک خط میں تحریر فرماتی ہیں: علی! دنیا کی حالت انتہائی خطرناک ہے، اس وقت عربی تعلیم حاصل کرنے والوں کا عقیدہ ٹھیک نہیں تو انگریزی دانوں سے کیا امید؟؟ علی! اگرچہ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انگریزی والے مرتبہ حاصل کرر ہے ہیں کوئی ڈپٹی ہو رہا ہے، تو کوئی جج، کم از کم بیرسٹر اور وکیل ہونا تو ضروری ہی ہے مگر میں بالکل اس کے خلاف ہوں، میں انگریزی دانوں کو جاہل اور اس علم کو بے سود اور بالکل بے کار سمجھتی ہوں، علی! اگر میرے سو (۱۰۰) اولاد ہوتیں تو میں انہیں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو (۱۰۰) کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں، اور میں دارین میں سرخرو اور نیک نام اور صاحب اولاد کہلاؤں، (آمین ثم آمین یارب العالمین)

۲۵ رجون ۱۹۴۷ء کو حج کی سعادت حاصل ہوئی۔

وفات

آخر سفر آخرت کی منزل شروع ہوگئی، ۶ رجمادی الاخری ۱۳۸۸ھ سنیچر کی رات بے چینی سے گزری، ظہر کی نماز ہوش وحواس کے ساتھ پڑھی اور انگلی پر ذکر شروع کردیا، اپنی تین مرحومہ بہنوں کا نام لے کر کہا کہ وہ لکھنؤ آگئیں اس کے بعد ہی نزع کی کیفیت شروع ہوگئی، سانس سے اسم ذات اللہ اللہ کی آواز آنے لگی، جب یہ آواز موقوف ہوگئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر اپنے اس خالق و مالک کے پاس پہنچ گئیں جس کا وہ ساری عمر نام لیتی رہی تھیں۔ رحمہا اللہ۔

ملفوظات

فرماتی تھیں: دعا کی توفیق ملنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ

اس کا بندہ اس سے خوب جی کھول کے اور جی بھر کے مانگے، اس لیے ایسے موقع پر کوتاہی، بے نیازی اور مایوسی یا بے دلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، دعا کی توفیق در پردہ اس بات کا اشارہ ہے کہ ہم دینا تو چاہتے ہیں تم مانگنا تو سیکھو۔

بچوں کی تربیت کس طرح ہو اس کے چند اصول بیان کرتی ہیں:

بری صحبتوں سے دور رکھو، ہر وقت خیال رکھو کہ ان کی طبیعت کسی اور کی طرف مائل نہ ہو، ان کی ضد پوری نہ کرو، مانگنے سے پہلے ان کی خواہش پوری کر دو کہ ضد پیدا نہ ہو، ان کے ساتھ ایسا انداز رکھو کہ وہ تم سے بے خوف نہ ہوں، تمہارا اشارہ ان کو کافی ہو، بہت مارنے اور بار بار کہنے سے بچے بے حیاء ہو جاتے ہیں، بس اشارہ سے کام لو، سب بچوں کو ایک نظر سے دیکھو، ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دو، کہ ایک دوسرے کو ذلیل سمجھیں، لڑکیوں کو نصیحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں: دو شخص جب برابر ہوں اور تم کچھ دینا چاہو تو برابر دو، زیادہ کم دینے میں تم بے وقوف کہلاؤ گی، اور کم حصہ والی کی سبکی ہوگی، دو شخصوں کے سامنے ان میں سے ایک کی تعریف نہ کرو، کسی کی دل شکنی نہ کرو، جس سے محبت کرو خدا کی خوشی کے لیے کرو، جو بات کہو موقع پا کر کہو، اگر کھانے کا ذکر ہو تو تم کپڑوں کا تذکرہ نہ کرو کہ مثل صادق آئے ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' ایک کی بات ختم ہو جائے تو تم کہو، کوئی تمہاری مروت و محبت یا کسی اور خیال سے تمہارا کچھ کام کر دے تو اس کام میں بڑائی مت نکالو، ہر شخص کا احسان مانو۔

دعا اور معمولات کا بیان کرتے ہوئے آخری مشورہ دیتی ہیں: تم دنیا کے سارے کام کرتی ہو اور دن بھر دنیا دھندے میں لگی رہتی ہو، محنت کرتی ہو، اور تھکتی ہو، اگر تھوڑا وقت دعا کے لیے نکال لو تو تمہیں دین و آخرت کا فائدہ حاصل ہو جائے گا، اور تم اللہ کے ذمہ ہو جاؤ گی، انہیں دعاؤں کی برکتوں سے وہ وہ حاصل ہوا کہ میرا دل جانتا ہے میں اس منعم حقیقی کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔

میں سب قابل تھی اے لوگو! جہاں میں
مگر سب کچھ دیا اس نے بلا کر

حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ

(برادر مشفق مفکر اسلام)☆

ولادت

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ ۲۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ مطابق یکم دسمبر ۱۸۹۳ء کو اتوار کے دن ضلع فتح پور (یوپی) کے ایک تاریخی قصبہ ہنسوہ میں پیدا ہوئے، جو آپ کا نانیہال تھا، آپ نسباً حسنی تھے، سلسلہ نسب حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ الشہید بن حضرت عبداللہ المحض بن حضرت حسن مثنی بن حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہوتا ہے۔

آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ مصنف ''گل رعنا'' اور ''نزہۃ الخواطر'' عالم و زاہد وصالح شخص تھے، علمی میدان میں بہت بلند پایہ مقام کے حامل ہونے کے ساتھ صلاح وتقویٰ میں امتیاز و درجہ کمال حاصل تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے اجازت یافتہ تھے، ۱۹۱۵ء میں بالاتفاق ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے، اور ۱۹۲۳ء میں دار فانی سے دار بقاء کو کوچ کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ و غفرلہ۔

والدہ ماجدہ مولانا سید عبدالعزیز صاحبؒ کی صاحبزادی تھیں، جن کا سلسلہ نسب حضرت سیدنا حسن سبط الرسولؐ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے، ابھی ڈاکٹر صاحب کی عمر

☆ ماخوذ از: فرشتہ صفت انسان، ص: ۳۸-۴۶

آٹھ سال کی ہی تھی کہ والدہ مخدومہ سیدہ زینب بی بی رحلت فرما گئیں، رحمہا اللہ تعالیٰ وغفر لہا، ماموں مولانا سید ابوالقاسم صاحب عالم صالح اور ولی صفت شخص تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تربیت یافتہ اور مرید خاص رہے، انہیں بھی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور بعض دوسرے مشائخ طریقت سے اجازت وخلافت حاصل تھی، ان کے دادا اور مولانا عبدالحی حسنی کے نانا مولانا سید سراج الدین ہنسوی حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدین باکمال اور مجازین میں تھے، جن کے تربیت یافتہ لوگوں میں ایک اہم نام ان ہی کے بھتیجے مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسوی کا ہے، (۱) جن کا شمار سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے نامور مشائخ اور علمائے راسخین میں ہوتا ہے، اور مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی کے خسر بھی تھے۔ (۲)

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے بچپن کا بیشتر حصہ ننیہال (ہنسوہ ضلع فتح پور) میں اور پھر دادیہال (تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) میں گزرا، آپ کے جد بزرگوار مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی صاحب بذات خود بڑے باکمال اور نامور مصنف، شاعر، صوفی اور حضرت امیر المومنین سیدنا سید احمد شہیدؒ کے بیک واسطہ خلیفہ مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی کے خلیفہ ومجاز تھے، ان کے سایہ عاطفت میں ڈاکٹر صاحب کے مبارک ایام گزرے اور علم سیکھا۔

تسمیہ خوانی ہنسوہ میں ہوئی، قرآن کریم اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم ہنسوہ میں حاصل کی، جہاں مولانا عبدالحلیم کیرانوی صاحب (جن کا روحانی تعلق حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے اور شرف تلمذ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، علامہ کیرانویؒ بانی مدرسہ

---

(۱) مولانا شاہ عبدالسلام ہنسوی کے خلفاء میں مولانا شاہ نجم الدین فتح پوری اور مولانا ناظر علی کاکوروی کا نام بہت نمایاں ہے، مولانا ناظر علی کے صاحبزادے امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی کے پوتے جن سے شیعی اثرات اور بدعات وخرافات کے ازالہ کا کام بڑے پیمانہ پر ہوا، اورانہوں نے اس تعلق سے تجدیدی خدمات انجام دیں۔

(۲) مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی کے بھانجے تھے، اوران کا پہلا نکاح تکیہ رائے بریلی کے حسنی سادات میں ہوا تھا، دوسرا نکاح ہنسوہ کے حسینی سادات میں مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسوی کی صاحبزادی سے ہوا۔

صولتیہ مکہ مکرمہ سے تھا) قیام فرماتے تھے، ان کے پاس مکتب نشینی کی، چنانچہ آپ کو ان دونوں جگہ علمی و روحانی ماحول میسر آیا، جہاں آپ نے نیک صحبتوں اور سنجیدہ وادب آموز مجلسوں کے مواقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، اور اپنے اندر وہ صفات پیدا کیں، جو ایک مومن کامل کے شایان شان اور ایک عالم ربانی کے لیے ضروری ہوتی ہیں، آپ کے والد ماجدؒ جو ایک بڑے نباض، عالم، عارف، حکیم تھے، برابر آپ کو خطوط کے ذریعہ تعلیمی ہدایات کرتے رہتے اور ایک ایک چیز کی برابر خبر رکھتے، پھر والد صاحب کے پاس لکھنؤ آ گئے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے کسب فیض کیا، تمام اساتذہ آپ کا بڑا خیال رکھتے، یہاں سے تکمیل تعلیم کے بعد والد صاحب کے ایماء پر دار العلوم دیوبند گئے، جو اس وقت درس حدیث کا ایک بڑا مرکز تھا، ایک طرف شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی اسیر مالٹا مسند آرا تھے، تو دوسری طرف علم حدیث میں امام وقت علامہ انور شاہ کشمیریؒ رونق افروز تھے، اول الذکر سے آپ نے صحیح بخاری اور سنن ترمذی کا درس لیا، اور ثانی الذکر سے ابوداؤد شریف پڑھی، اور دونوں ماہرین فن شیوخ کے درس کی تقریریں بحسن وخوبی عربی زبان میں قلم بند کرتے جاتے تھے، افسوس کہ کسی نے استفادہ کے لیے لے لیا اور پھر واپس نہیں کیا، جس کا حضرت ڈاکٹر صاحب کو صدمہ رہا۔

علم دین کی تکمیل کے بعد طب کی طرف میلان ہوا، والد صاحب کی بھی خواہش تھی اور آپ کے لیے یہ ایک خاندانی علم تھا، چنانچہ آپ نے والد صاحب سے طب کی تمام متداول کتابیں پڑھیں، پھر والد ماجد کے ایما سے ہی حاذق الملک حکیم اجمل خاں کی خدمت میں دہلی گئے اور جلد ہی ان کے یہاں اعتماد پیدا کر لیا، اس کے ساتھ ساتھ نامور ڈاکٹر اور عظیم مجاہد آزادی وقائد ملت ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے بھی استفادہ کرتے جاتے تھے، وہاں سے واپسی پر انگریزی تعلیم کا شوق پیدا ہوا، حالانکہ اس وقت آپ کی شادی ہو چکی تھی، اور بیس بائیس سال عمر تھی، لیکن اپنی صلاحیت واستعداد سے اتنی انگریزی بھی سیکھ لی کہ سنٹ نیل اسکول کے نویں درجہ میں داخلہ کروالیا، جہاں تعلیم کا معیار خاصہ بلند تھا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی وضع وقطع، لباس ومعمولات میں کسی قسم کا ذرہ برابر

فرق نہ آنے دیا، پوری شرعی داڑھی، شرعی کرتا و پائجامہ، اپنے وقت پر نمازوں کی پابندی وغیرہ امور دیگراں، اساتذہ آپ کا پورا لحاظ اور طلبہ پورا احترام کرتے تھے، آپ تعلیم میں برابر ترقی کرتے گئے، بی ایس سی (B.S.C.) میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور وہاں بھی اپنے احوال و معمولات میں کسی قدر بھی فرق نہ آنے دیا، امتحان ہال میں نماز کا وقت آگیا، وہیں شیروانی بچھائی اور نماز شروع کردی، جس پر امتحان ہال کے نگراں کو معذرت بھی کرنی پڑی، ۱۹۲۵ء میں میڈیکل کالج لکھنؤ میں **M.B.B.S.** کا کورس مکمل کیا، اور کامیابی حاصل کی، اور اس کے بعد سے والد صاحب کے مطلب کے قریب مطب کرنا شروع کردیا، اہم بات یہ ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ شفیق باپ، مشفق مربی دنیا سے رخصت ہوگئے، اس اچانک حادثہ کا آپ پر بڑا گہرا اثر پڑا، سوئے اتفاق کہ اس موقع پر آپ یہاں موجود بھی نہ تھے، بلکہ میڈیکل کالج ہی کی طرف سے آپ مدراس گئے ہوئے تھے، اس چیز نے اور متاثر کیا، ڈاکٹر صاحب اپنے والد کے بڑے محبوب و عزیز فرزند تھے، اور اپنے والد ماجد کی حکم برداری، اطاعت، حسن سلوک میں بڑے ممتاز تھے۔(۱)

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کے سانحہ ارتحال سے جہاں آپ کو عظیم صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، وہیں آپ پر ایک ساتھ دوہری ذمہ داریاں آپڑیں، آپ پر بوجھ اس بات سے اور بڑھا کہ والد علیہ الرحمہ نے ترکہ میں صرف ایک روپیہ چھوڑا، جو ان کے زہد عن الدنیا اور دین کے کاموں میں لوجہ اللہ خدمت کی نشاندہی کرتا ہے،(۲) حضرت ڈاکٹر صاحب کو ایک طرف اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر اور ذمہ داری اور دوسری طرف اپنی دو چھوٹی بہنوں اور عزیز بھائی (یہ تینوں مولانا عبدالحی کی زوجہ ثانیہ سے ہیں) کی فکر اور

---

(۱) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "حیات عبدالحی"، از حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

(۲) آپ کی ایک صفت یہ تھی کہ دن بھر کی آمدنی شام تک خرچ کردینا ضروری سمجھتے تھے، اور رات کو باقی رکھنا برا جانتے تھے، اسی وجہ سے آپ پر کبھی زکاۃ فرض نہیں ہوئی، اور ترکہ و جائیداد میں کچھ نہیں چھوڑا۔ (حیات عبدالحی، ص: ۲۴۷)

ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری، اسے کس طرح وہ کریں اور نبھائیں، ڈاکٹر صاحب ہر معاملہ میں پہلے دین وشریعت کو دیکھتے تھے اور اسوہ نبویہ کو نمونہ جانتے تھے، چنانچہ آپ نے جس انداز وطریقہ سے یہ عظیم ذمہ داری نبھائی اور یہ مشکل کام بحسن وخوبی انجام دیا، کہ یہ چھوٹے بھائی جن کا نام ابوالحسن علی تھا، وہ اس وقت اسلام کے عظیم مفکر مصلح اور داعی، عالم ربانی اور امام کی حیثیت سے عالم اسلام میں متعارف ہیں، اور صرف متعارف ہی نہیں بلکہ عرب وعجم ان کے گرویدہ ہیں، اور ان کی تحریر وتقریر کا لوگوں پر گہرا اثر ہے، دونوں بہنیں بھی اپنے خانوادہ میں علم وفضل اور صلاح وتقوی میں ممتاز رہیں۔

تعلیم وتربیت ومردم سازی کا ایک دوسرا حیرت انگیز نمونہ خود ان ہی کے فخر ہند فرزند مولانا سید محمد الحسنی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے، جن کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر بعض اہل نظر نے "رجل موهوب" کہا، اور جن کی بےنفسی، صلاح وتقویٰ کو دیکھ کر بعض اہل علم نے ''فرشتہ صفت انسان'' کہا، ان کے علاوہ خواہر زادگان میں مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی مظاہری، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے وہ مبارک اسماء ہیں کہ جن کے فیوض وبرکات سے بھی ایک عالم مستفید ہو رہا ہے، دین اور دین کا علم خود ہی سکھایا، انہیں مسؤلیت کا ہر ہر لمحہ پورا خیال رہا، جس کا حدیث نبوی میں ذکر آیا ہے کہ " ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته" اولاد کی تعلیم وتربیت سے متعلق ان کی ہی ایک صاحبزادی (والدہ مولانا سید محمد حمزہ حسنی مدیر ماہنامہ رضوان لکھنؤ) کی تحریر ملاحظہ ہو:

> ''میرے والد صاحب ایک مشہور طبیب اور بڑے فاضل و عالم تھے، ان کو خدا نے اولاد کی تربیت کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا، انہوں نے اپنی ساری اولاد کی تعلیم وتربیت کا بخوبی انتظام کیا اور ان کو اردو عربی کی تعلیم دی، اور رفتار و گفتار پر ہر وقت نظر رکھی، جو غلط بات دیکھتے تو محبت و شفقت کے ساتھ متنبہ فرما دیتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی غیبوبت میں بھی کوئی بری بات کرتے طبیعت جھجکتی اور برائی سے نفرت پیدا ہو جاتی،

میری والدہ صاحبہ مرحومہ کو بھی علم دین سے حد درجہ لگاؤ تھا، وہ اکثر و بیشتر ''طریق النجاۃ'' (ترجمہ مشکاۃ المصابیح) پڑھا کرتیں، جب وہ کھانا کھا کر قیلولہ کرتیں تو اپنے ہاتھوں میں ''طریق النجاۃ'' لے لیتیں اور پڑھتی رہتیں، اسی طرح تسبیح پڑھنے کا بھی اہتمام کرتیں، ہم سب بھائی بہنوں پر کڑی نگاہ رکھتیں، اور غلط جگہ بیٹھنے پر بے کار کاموں کے کرنے سے روکتیں، والدین کے اسی طریق تعلیم و تربیت کے تحت میری پرورش ہوئی، اور میری تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

میری ذرا سی عمر بڑھی اور میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہوئی تو میرے والد صاحب قبلہ نے میرے لیے ایک استاد کا انتظام کیا، وہ مولوی صاحب بڑے دیندار اور صاحب علم تھے، وہ روز تشریف لاتے اور خوب سمجھا سمجھا کر پڑھاتے، جن کی تعلیم گھر کرتی چلی گئی، میں نے کلام پاک انہیں مولوی صاحب سے ختم کیا، کلام پاک کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''بہشتی زیور'' اور فارسی پڑھنی شروع کی، اردو میں بہشتی زیور سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا، درحقیقت بہشتی زیور میں مسائل کے علاوہ بھی بہت سی گھریلو زندگی میں کام آنے والی چیزیں اور چٹکلے نیز علاج و معالجہ کی باتیں معلوم ہوئیں، جنہوں نے مجھ کو بہت فائدہ پہنچایا، بہشتی زیور کے علاوہ مولانا عبدالحی حسنی صاحب کی ایک مختصر سی کتاب روزمرہ کام آنے والے مسائل پر ہے، وہ بھی میں نے پڑھی، انہیں مولانا عبدالحی صاحب کی دوسری کتاب جو بچوں کے لیے لکھی ہے، جس میں سوالات و جوابات کے انداز میں ایمان و عقیدہ، اعمال اور سیرت نبوی پر بیان ہے، ان کتابوں کے علاوہ مفتی کفایت اللہ صاحب کی مشہور کتاب ''تعلیم الاسلام'' کے تمام حصے بڑے شوق و ذوق سے پڑھے، اور ان سے بہت سے مسائل معلوم ہوئے، اور برابر کام آتے رہے۔

ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی مخصوص سورتیں جیسے سورہ یسین، سورہ رحمان، سورہ واقعہ، سورہ فتح، سورہ تبارک الذی یاد کیں، اس لیے کہ ان سورتوں کی فضیلتیں اور ان کے پڑھنے کا ثواب اپنے والدین اور بزرگوں سے برابر سنتی آتی تھی، یہاں تک پہنچی تھی کہ اب گھر کے اندر ہی پڑھنے لگی، کہ میرے استاد سے پردہ ہوگیا، اور میری عمر اس حد تک پہنچ گئی کہ اب گھر کے اندر ہی پڑھنے لگی، میرے والد صاحب جن کو خدا نے دینی و دنیوی علوم سے بخوبی نوازا تھا، مجھ کو خود پڑھانے لگے، اور عربی شروع کرادی، سب سے پہلے ''حکایات الاطفال'' پڑھائی، اس کے بعد بعض دوسری عربی کتابیں، عام مطالعہ میں میں نے سیرت عائشہ، الصالحات، اسوہ صحابیات، اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث کی ''حکایات صحابہ'' رکھی، نیز سیر الصحابیات اور مولانا حالی کی مسدس اور چپ کی داد، اور اقبال مرحوم کی ''شکوہ و جواب شکوہ'' مولانا محمد جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' اور عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ''سیرت سید احمد شہید'' بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھی۔'' (۱)

ڈاکٹر صاحب کا روحانی واصلاحی تعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے تھا، اور یہ تعلق بڑا عقیدت مندانہ اور والہانہ رہا، حضرت مدنی کو بھی آپ سے بڑا خصوصی تعلق اور آپ پر بڑا اعتماد تھا (۲) چنانچہ جب بھی لکھنؤ تشریف آوری ہوتی تو

---

(۱) ماہنامہ رضوان جولائی، اگست ۱۹۶۷ء

(۲) راقم کو مولانا احرار الحق صاحب استاد دارالعلوم دیوبند کے حوالہ سے یہ بات پہنچی اور دوسرے شواہد اس کی تصدیق بھی کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو حضرت مدنیؒ کی طرف سے اجازت بیعت و ارشاد بھی تھی، دارالعلوم دیوبند کے ایک دوسرے موقر استاد مولانا قمر الدین صاحب گورکھپوری نے بھی اپنی رائے بریلی تشریف آوری پر ایسا ہی خیال ظاہر فرمایا، جب وہ ڈاکٹر صاحب کی قبر پر حاضر ہوئے تھے اگرچہ اس فہرست میں ان کا نام نہیں ہے، جو ان کے خلفاء کی منظر عام پر آئی۔ واللہ أعلم بحقیقة الحال وانہما لقیا بجوار ربہما الآن۔

ڈاکٹر صاحب ہی کے مکان پر آرام فرما ہوتے، ورنہ اپنے مرید رشید حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کے مکان پر آرام فرما ہوتے، ڈاکٹر صاحب کے یہاں قیام کا سلسلہ ۱۹۲۸ء سے تا وفات رہا، اور حضرت مدنی کو اس میں کوئی تکلف نہیں تھا، کھانے میں بالکل سادہ پسند فرماتے تھے، ابھی حال میں حضرت مدنی اور ڈاکٹر صاحب کی وفات کے ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی بڑی صاحبزادی محترمہ سید حمیرا صاحبہ (رحمهما الله تعالیٰ وغفرلها) کی وفات پر (جو ۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ کو ہوئی) حضرت مدنی کی اہلیہ مخدومہ (رحمهما الله تعالیٰ وغفر لها) نے حضرت مولانا علی میاںؒ کو جو تعزیتی مکتوب بھیجا ہے اس سے گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے، جو اس مرید صادق اور مرشد مخلص اور ان کے اہل خانہ کے درمیان تھا، أبقاه الله تعالی، حضرت مدنی دسمبر ۱۹۵۷ء میں دنیا سے رخصت ہوئے اور ڈاکٹر صاحب نے یکم مئی ۱۹۶۱ء کو رحلت فرمائی، اللهم اغفر لهم وارفع درجاتهم، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے رکن اور ایک لمبی مدت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔

ڈاکٹر صاحب بڑے حسین وجمیل تھے، خوش رو، خوش مزاج اور خوش دل تھے، رئیس احمد جعفری صاحب مرحوم کہتے ہیں:

''چہرہ سورج کی طرح روشن، دل آئینہ کی طرف صاف، خفا کبھی نہیں ہوتے، بڑی سے بڑی خطا خوشی سے معاف کر دیتے ہیں۔''

مزید رقم طراز ہیں:

''گورا رنگ، دانت موتی کی طرح سفید، داڑھی کے بال بھورے تھے، اب سفید ہو چکے ہیں۔'' (۱)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ گویا ہیں:

''داڑھیاں اتنی خوشنما میں نے دو ہی دیکھی ہیں، ایک تو انہیں کی، دوسری مولانا عبدالماجد فرنگی محلی کی۔'' (۲)

---

(۱) دید و شنید، ص: ۲۱۷ مطبوعہ کراچی (۲) معاصرین، ص: ۱۴۸ مطبوعہ لکھنؤ

ذیل میں چند واقعات کے مطالعہ سے حضرت ڈاکٹر صاحب کے ورع وتقویٰ اور شرافت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو گھر کی ایک مجلس سے ماخوذ ہیں، جس میں ان کے گھر کے افراد بھانجے، داماد، پوتے، نواسے موجود تھے، اور حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک مجلس تھے، یہ مجلس افادۂ عام کی غرض سے نذر قارئین ہیں: (۱)

تعلیم وتعلم کا جذبہ

☆ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے ارشاد فرمایا: ماموں صاحب (حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ) حسن (ڈاکٹر صاحب کے بڑے نواسہ) کو بہت چاہتے تھے، انہوں نے حسن کو خود قرآن مجید کی تعلیم دی، جس سے ان کی محبت اور تعلم کے جذبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ماموں صاحب کے اندر تعلم کا جذبہ بھی اسی درجہ موجزن تھا، آپ حسن سے فرمایا کرتے تھے "اگر صاحب ایمان کو علم حاصل کرتے ہوئے موت آتی ہے تو اس کے درجات بہت بلند ہوتے ہیں" یہی وجہ تھی کہ اپنے آخری وقت میں حضرت ڈاکٹر صاحب، حسن صاحب مرحوم نے کہا کہ وہ ہم سے فرمایا کرتے تھے "تم روزانہ سامنے دروازے پر ہندی کے حروف اور ایک دو جملہ لکھ دیا کرو، اور یہ کہ تم ہم کو ہندی پڑھادو، ہم تم کو قرآن مجید پڑھائیں گے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری وقت تک حضرت ڈاکٹر صاحب کو حصول علم کا شوق رہا، جو کہ درحقیقت ان کا اس حدیث پر عمل تھا جس کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له طريقا الى الجنة" یعنی جو علم کے حصول کے لیے کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ اس کے لیے جنت کے راستہ کو آسان فرمادیتا ہے۔

اطاعت وفرمانبرداری

☆ ان کے اندر اعلیٰ درجہ کی والدین کی اطاعت پائی جاتی تھی، بالخصوص اپنے والد ماجد کی اطاعت کرنے میں انہوں نے ایک مثال قائم کردی تھی، ایک مرتبہ کا

(۱) از روزنامچہ سید محمود حسن حسنی ندوی، مؤرخہ ۱۱/اپریل ۱۹۹۸ء، بروز ہفتہ

واقعہ ہے کہ آپ کے امتحانات چل رہے تھے، جس کا علم غالباً والد ماجد رحمہ اللہ کو نہیں تھا، لہٰذا والد ماجد نے ارشاد فرمایا: عبدو! (ڈاکٹر صاحب کا گھر کا نام ہے) تم کو فلاں جگہ شادی میں جانا ہے، چنانچہ حضرت ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر کچھ نہیں کہا، اور امتحان چھوڑ کر شادی میں جانے کے لیے تیار ہو گئے، کیونکہ اگر نہ جانے کا عذر پیش فرماتے تو ممکن تھا کہ یہ سمجھا جاتا کہ بات کو ماننے کا جذبہ نہیں ہے، اس لیے فوراً بات کو مان لیا، لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اچانک منشی خلیل صاحب جو حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے دوستوں میں ہیں تشریف لائے، اور انہوں نے فرمایا: آپ کے عبدو کا امتحان ہے، ان کو شادی میں نہ بھیجو۔

☆ ایک مرتبہ والد صاحب گھر میں تشریف رکھتے تھے، کہ اچانک ڈاکٹر صاحب تھکے ماندے دوپہر کی تیز دھوپ میں میڈیکل کالج سے واپس ہو کر گھر لوٹے ہی تھے، کہ فوراً والد صاحب نے ارشاد فرمایا: فلاں دوا کی ضرورت ہے، جا کر لے آؤ، لیکن اس پر بھی حضرت ڈاکٹر صاحب کچھ نہیں فرماتے ہیں، بلکہ خوشی خوشی بازار جاتے ہیں، اور فوراً دوا لا کر والد ماجد کی خدمت میں پیش فرما دیتے ہیں۔

جذبہ صلہ رحمی

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ اپنے والد ماجد کے دوست واحباب اور بھائیوں کے ساتھ بھی نیازمندانہ طریقہ سے پیش آتے تھے، اور ان کے حکم کی تعمیل بھی کرتے تھے، جس کا آج کے دور میں تصور بھی مشکل ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی اپنے دادا سید خلیل الدین صاحبؒ کا واقعہ سناتے ہیں: جب سید خلیل الدین صاحب، ڈاکٹر صاحب کے مکان میں فروکش تھے، تو سید خلیل الدین صاحبؒ سے ان کے ایک عزیز نے کہا: یہ تمہارا گھر نہیں ہے، لیکن انہوں نے فرمایا: نہیں، یہ ہمارا ہی گھر ہے، اور اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ کہنے کے لیے انہوں نے ڈاکٹر صاب سے فرمایا: عبدو! تم سے یہاں نکل جاؤ، چنانچہ ڈاکٹر صاحب فوراً اسی وقت سر جھکا کر وہاں سے باہر چلے گئے۔

ورع وتقویٰ

☆ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی ارشاد فرماتے ہیں: ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ماموں صاحب کو ندوۃ العلماء کے کام سے ندوہ کی سواری سے ندوہ جانا تھا، وہ ندوہ کے ناظم تھے، اور ان کے ہمراہ مولانا عمران خاں صاحب (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء) بھی تھے، کہ اچانک ان حضرات نے ہم کو راستہ میں پیدل جاتے دیکھا، تو اپنی سواری پر بٹھالیا، مگر مہتمم دارالعلوم سے اجازت لی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب ذاتی کام سے ذاتی سواری پر نہیں جارہے تھے، اور چونکہ میں ان کا بھانجہ تھا، اس لیے اس کا بھی انہوں نے پورا خیال رکھا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پوری احتیاط سے بھی کام لیا۔

☆ حضرت ڈاکٹر صاحب کے داماد مولانا سید محمد طاہر صاحب منصور پوریؒ نے فرمایا: ان کا حال یہ تھا کہ جب ندوہ کا کام ادارے کے قلم سے کرتے تھے، تو اس قلم کو اپنے ذاتی کام کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے، اور بتاتے ہیں کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ قلم جب خراب ہوجاتا تھا تو اس کو ایسے ہی نہیں پھینک دیتے تھے، بلکہ اس کو فروخت کرتے تھے، اور دوسرا قلم ادارے کے لیے خریدتے تھے۔

دعوت اسلام ☆

حضرت ڈاکٹر صاحب کے حقیقی معنوں میں نور نظر اور لخت جگر حفید اکبر مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ نے بتایا: ایک دن کچھ لوگ آئے، ان سے ملے اور اپنے خاندان و برادری کے افراد کے اسلام لانے سے متعلق بتایا کہ یہ سب ڈاکٹر صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اور ان کے مبلغین کا ذکر کیا جو انہیں آکر دین سکھاتے تھے، نام پوچھے جانے پر سکندر صاحب اور نجم الدین صاحب کے نام بھی بتائے، البتہ یہ بھی بتایا کہ رابطہ کمزور ہوجانے سے یہ نقصان ہورہا ہے کہ ہم میں جس کی جہاں شادی ہوجاتی ہے وہ انہیں میں ہوجاتا ہے، الحمدللہ اب یہ لوگ واپس وہیں آگئے ہیں، جہاں سے انہیں روشنی ملی

☆ یہ آخری دو قطعے "فرشتہ صفت انسان" کے حاشیہ سے ماخوذ ہیں جو کہ مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے افادات کا خلاصہ ہے۔

تھی، اور یہ لوگ ان فکرمند دادا کے دل دردمند رکھنے والے پوتے کے رابطہ میں ہیں، جو اپنے ان عظیم دادا کے اس دعوتی و ایمانی دردوغم کو لے کر چپہ چپہ پھر رہے ہیں، اور دسترخوان اسلام پر آنے والے نئے نئے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔

دعوت وتبلیغ

دعوتی و تبلیغی جذبہ شروع سے آپ کے اندر موجزن تھا، اور خاموشی سے اس کی فکر رکھتے اور ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داریوں کے بعد یہ احساس اور زیادہ بڑھا، متعدد ایسے ندوی فضلاء تھے جن کو آپ مختلف دیہاتوں وغیرہ میں بھیجتے جہاں تھوڑی بہت بھی پیاس محسوس کرتے، چنانچہ یہ لوگ وہاں جا کر دین کی باتیں بتاتے، اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کا تعارف کرتے، ڈاکٹر صاحب کو اس کی بڑی فکر رہتی تھی، چنانچہ ان کی کوششوں سے متعدد غیر مسلم بچے مسلمان ہوئے اور ان کو آپ نے ندوہ میں تعلیم دلائی، جو بعد میں شہرت یافتہ ادیب وعالم بنے، جن میں خصوصیت سے ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی مرحوم (جامعہ ملیہ دہلی) اور مولانا سلمان ندوی سابق ایڈیٹر "الدعوۃ" دہلی کے نام قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ بھی اور کئی نام ہیں، جن کے نام اور کام کو دیکھ کر لوگوں کو یہی احساس ہوتا تھا کہ یہ پشتینی مسلمان ہیں، ڈاکٹر صاحب برادران وطن کے پسماندہ طبقات اور اچھوتوں میں بھی جاتے اور اسلام کا پیغام مساوات عملی طور پر پیش کرتے، ان کے بڑے داماد اور راقم کے دادا جناب سید محمد مسلم حسنیؒ فرماتے ہیں کہ بعض جگہوں پر میں بھی ان کے ساتھ گیا، اور ان کو دیکھا کہ وہ اچھوتوں کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر زمین میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں، اسی طرح وہ مختلف مقامات پر جاتے، ان مسلمانوں کے لیے بھی دعاۃ بھیجتے جو نام کے مسلمان رہ گئے تھے، پھر جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے دعوتی کام کا علم ہوا تو علی میاں (چھوٹے بھائی) کو واقفیت کے لیے بھیجا، اور واقفیت حاصل کر لینے کے بعد لکھنؤ کے اپنے دائرہ میں رہ کر عملی طور پر اس تحریک و جماعت کا تعاون کیا، اور دوسروں کو متوجہ کر کے باہر سے اس کام کو تقویت پہنچائی، اور اپنے بھائی مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو اس کام کے لیے فارغ کیا۔

حضرت سیدہ امۃ العزیز صاحبہؒ

(ہمشیرہ محترمہ مفکر اسلام)

ولادت باسعادت

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی بڑی صاحبزادی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی بڑی ہمشیرہ ہیں، آپ کی ولادت ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں رائے بریلی میں ہوئی، اور تکیہ شاہ علم اللہ کے روحانی ماحول میں آنکھیں کھولیں، نانا حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب شیخ وقت اس وقت تک حیات تھے، اوران کا روحانی فیض جاری وساری تھا، اور خود والد صاحب اور دادا صاحب مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی علم وعمل کے جامع اور سلوک ومعرفت کے رمز شناس تھے، ایسے روحانی اور دینی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی، تعلیمی مراحل خاندانی روایت کے مطابق گھر میں طے کئے، اور جلد ہی لکھنے پڑھنے کی قابل ہوگئی، ۳/۴ کتابیں بھی آپ کے قلم سے سامنے آگئیں، مگر طبع نہ ہوسکیں، ماہنامہ ''رضوان'' میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

جو بہتر سے بہتر اوصاف ایک شریف خاندانی خاتون میں ہوسکتے تھے وہ ان کے اندر جمع ہوگئے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ ''کاروان زندگی'' حصہ ششم میں رقم طراز ہیں: ہمشیرہ مرحومہ اپنے اسلاف اور خاندانی خصوصیات سے

متصف اور ان کی وارث اور نمونہ تھیں، شفقت عام، صلہ رحمی، حسن سلوک، ذکر و عبادت، دعاو تضرع ان کی خاص صفات تھیں۔

ان کی شفقت تو اس قدر عام تھی کہ ہر آنے جانے والا اس کو محسوس کرتا تھا، گھر میں کام کرنے والیوں اور پاس پڑوس سے آنے والوں کے حق میں نہایت شفیق تھیں، گھر میں آنے والی مہترانی نے ایسے ہی ایک دن حلوہ کھانے کی خواہش کی، حلوہ پکوا کر پوری ہانڈی اس کے حوالے کردی، نہ جانے اس طرح کتنے واقعات پیش آتے رہتے تھے ان کی اس ادا سے وہ لوگ بھی واقف ہو گئے تھے، جس سے وہ فیضیاب ہوتے رہتے تھے، اس طرح اس اللہ کی نیک بندی نے اپنی پوری زندگی ذکر وعبادت اور بندگان خدا کے ساتھ شفقت، خاص طور پر کمزوروں اور ضعیفوں سے ہمدردی اور ان کے ساتھ غم خواری میں گزاردی اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں، اپنے پیچھے دو فرزند چھوڑے، ایک (حال ناظم ندوۃ العلماء) مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب اور دوسرے مشہور عربی جریدہ (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء و ایڈیٹر "الرائد") مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ہیں، بڑے صاحبزادے مولانا سید محمد ثانی حسنی صاحب ان کی حیات ہی میں وفات پا گئے تھے، جو گوناگوں صفات کے حامل اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے خلیفہ و مجاز بیعت تھے، سیدہ امۃ العزیز صاحبہ کا بھی بیعت کا تعلق حضرت شیخ الحدیث سے تھا، ان سے مراسلت بھی رکھتیں، اور اپنے احوال بیان کرتیں، حضرت شیخ اہتمام سے جواب دیتے، اور ہمشیرہ صاحبہ کے لفظ سے مخاطب کرتے۔

وفات

رمضان شریف کی تیئسویں شب ۱۴۱۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی جب کہ زبان پر کلمہ اللہ بلند آواز سے جاری تھا۔ رحمہا اللہ تعالیٰ۔

موت کا استحضار ہر وقت رہتا تھا، قبر کے عذاب کا خوف طاری رہتا تھا، ورا پنی

مجلس میں کثرت سے اس کا تذکرہ کرتیں، آخر میں یہ بات بہت بڑھ گئی تھی، موت کا خوف جب بہت بڑھ جاتا تھا تو حضرت شیخ کو خط لکھتی تھیں، وہ تشفی دیتے تھے، آخرت کا خوف اور دینی رسالوں کا مطالعہ اور معمولات کی پابندی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں پوری دلچسپی لیتی تھیں، کھانا پکانے، سینے سلانے، اور گھر کی دوسری ذمہ داریوں کو صحیح طور پر انجام دیتی تھیں۔

اسی طرح غریبوں کا دل دکھانے یا ان کو کمتر سمجھنے پر بہت زیادہ ناگواری ظاہر کرتی تھیں، اور اپنے کو ناکارہ اور کمتر و بے حیثیت سمجھتی تھیں، خاندان کا کوئی بچہ اگر کسی غریب بچہ کے ساتھ اہانت کا معاملہ کرتا، تو سخت سزا دیتی تھیں اور معافی منگواتی تھیں، کسی کی پریشانی آپ سے دیکھی نہیں جاتی تھی، یہ گوارہ نہ تھا کہ گھر کے لوگ آرام و راحت سے رہیں، اور دوسروں کے گھروں میں فاقہ ہو اور پہننے کو نہ ہو، اس کے تدارک کی کوشش کرتیں۔

گھر میں کام کرنے والی غریبوں کے ساتھ بھی عزت کا معاملہ کرتی تھیں، اور ہر کام خود کرنا چاہتیں، دوسروں سے خدمت لینا پسند نہ تھا، یہاں تک کہ وزنی چیزیں بھی خود اٹھا لیتی تھیں، اکثر بزرگوں کا تذکرہ کرتیں، دنیا کے تذکرے کو ناپسند کرتیں، اور لایعنی کاموں سے بچتی تھیں، امیروں اور دولت مندوں کے تذکرے کے بجائے صالحین کے تذکرہ کو پسند کرتی تھیں، دینی تحریکوں اور کاموں سے دلچسپی تھی، گھر کے بچوں کو ان سے تعلق رکھنے پر ترغیب دیتی تھیں، لوگوں کے ساتھ دالداری کا معاملہ رکھتیں، اور اعلیٰ اخلاق سے پیش آتیں، دل توڑنے سے آپ کو نفرت تھی دل جوڑنا آپ کا شیوہ تھا، آپ صاحب دعا تھیں۔

چند معمولات اور اقوال

مخدومہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہؒ مفید اور کارآمد باتوں سے لوگوں کو نوازتی رہتی تھیں، اور آپ کے پاس بیٹھنے والا کچھ لے کر ہی جاتا تھا، کبھی ان کی کارآمد باتیں ماہنامہ

''رضوان'' میں افادۂ عام کے لیے شائع ہوتی تھیں، ان ہی اقوال میں سے ہے۔

فرماتی ہیں:- حقیقی سکون نہ دولت میں ہے، نہ لباس وزیور میں، نہ خوبصورتی اور زیب وآرائش میں اور نہ محل میں۔

حقیقی سکون اور چین صرف خدا کی یاد سے حاصل ہوتا ہے ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (الرعد:۲۸) یاد رکھو خدا کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

اور فرماتیں: وہ بڑا خوش نصیب ہے جس کو دل کا چین نصیب ہو، اور فرماتیں وہ مجلس بڑی نامبارک ہے، جس میں سب کچھ ہو مگر خدا کا ذکر نہ ہو۔

دل کی قناعت کو اللہ کا بڑا مقام اور بڑی دولت سمجھتیں، فرماتیں: دل کی قناعت سب سے بڑی دولت ہے، جس کو یہ دولت حاصل ہے وہ موتیوں سے تولے جانے کے قابل ہے۔

حرص وہوس اور خود پرستی کو مہلک ترین بیماری خیال کرتیں۔

فرماتی تھیں: سب سے بڑا اور مہلک مرض حرص وہوس اور خود پرستی ہے، جس کو یہ روگ لگ گیا، وہ آدمی نہیں جانور سے بدتر ہے، ایسا شخص کبھی بھی چین سے نہیں رہ سکتا، اور نہ دوسروں کو چین سے زندگی گزارنے دیتا ہے۔

فرماتی تھیں: حرص وہوس کا پیٹ صرف موت بھر سکتی ہے۔

آپ صبر وعمل کا پیکر تھیں، دوسروں کو بھی اسی کی نصیحت کرتیں۔

فرماتیں: جب کوئی مصیبت آجائے تو بجائے گڑگڑانے اور واویلا مچانے کے خدا کی جناب میں دعا کرنے، نماز پڑھنے اور صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔

اسی طرح آپ سراپا دعا وخشیت تھیں، اعتراف ذنب وقصور کے ساتھ بڑے الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعا پڑھتیں، ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (الأعراف:۲۳) اور فرماتیں حضرت آدم علیہ

السلام وحوا علیہا السلام نے یہ دعا مانگ کر ہم سب پر کتنا بڑا احسان کیا، انتقال سے چند گھنٹے پہلے بھی یہ دعا آپ کی زبان پر جاری تھیں، اور پورے استحضار کے ساتھ، اور ویسے بھی کثرت سے اس دعا کا ورد رکھتیں۔

ایک اور دعا "اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ فِیْمَنْ هَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیْمَنْ عَافَیْتَ" کا بھی کثرت سے پڑھنے کا معمول بنائے رکھا، یہ پوچھے جانے پر کہ اس دعا ہی کا کیوں اہتمام ہے؟ فرماتیں: ہدایت وعافیت جس کو مل گئی اس کا کیا کہنا یہ دونوں چیزیں سب سے بڑی نعمت ہیں۔

سُبْحَانَ ذِیْ الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ، والی دعا بھی آپ کی زبان پر کثرت سے جاری رہتی تھی۔

اس طرح ان دعاؤں کے ساتھ آپ پر خشیت کا غلبہ تھا، اور راضی برضا رہنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی، یتیموں اور بیواؤں کی آپ کی نگاہ میں خصوصی قدر تھی، ان کے ساتھ بڑا احسن سلوک کرتیں۔

فائدہ

ماشاء اللہ ان صفات وارشادات میں ہماری عورتوں کے لیے اور ہم سب کے لیے بہترین عبرت ونصیحت کا سامان ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

حضرت سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ

(ہمشیرہ محترمہ مفکر اسلام)

پیدائش

حضرت مولانا سید عبدالحی صاحبؒ کی صاحبزادی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ہمشیرہ محترمہ ہیں، ۱۸/جون ۱۹۰۸ء بروز جمعرات ان کی ولادت ہوئی چونکہ علمی گھرانے سے تعلق تھا اور گھر میں ہمہ وقت علمی فضا چھائی رہتی تھی، اور خود ان کے والد صاحب عظیم مصنفوں میں سے تھے، اس لیے کتب بینی کا بے حد ذوق و شوق تھا کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتی تھیں، اس طرح ان کے اندر پڑھنے اور لکھنے کا شوق بڑھتا رہا، اور اپنی محنت، ذوق وشوق اور اہل علم گھرانے اور اہل علم حضرات کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ ان کا قلم اچھا خاصا رواں ہو گیا، اسی زمانہ میں انہوں نے (میری بے زبان استانیاں) کے نام سے ایک مضمون تحریر کیا، جو اس وقت کے سنجیدہ رسالہ خواتین ''مسلمہ'' میں چھپا، ۱۹۲۶ء میں ان کی شادی اپنے حقیقی ماموں زاد بھائی مولانا سید ابوالخیر صاحب حسنیؒ سے ہوئی، جو ایک کہنہ مشق شاعر و ادیب اور حافظ حدیث عالم تھے، وہ زمانہ بھی شعر و شاعری کی گرم بازاری اور اصناف سخن میں طبع آزمائی کا تھا، ایسے بلند پایہ ادیب و شاعر سے رشتہ زوجیت میں منسلک ہونے کے بعد ان کا ذوق اور نکھر گیا، ان سے ان کی تین اولاد ہوئیں، لیکن

تینوں ایام شیر خوارگی ہی میں فوت ہوگئیں، جس کا اثر قلب ودماغ پر پڑنا لازمی تھا۔

اس کے علاوہ بعض ایسے خاندانی حوادث اور خانگی پریشانیاں پیش آئیں، جس میں ان کی سخت آزمائش تھی، دل کمزور، دردمند اور حد درجہ حساس تھا، لیکن انہوں نے اپنی قوت ایمانی اور کسی قدر علمی مشغلے اور ذوق کی مدد سے اس کو نہ صرف برداشت کیا، بلکہ ان کی زندگی کا یہ موڑ ان کی ہزاروں ترقیوں اور سعادتوں کا ذریعہ بن گیا۔

ان کے سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے ایک نسخہ تجویز کیا، کہ وہ مشہور ومقبول امام نوویؒ کی کتاب ''ریاض الصالحین'' کا اردو میں ترجمہ کردیں، جو ابھی تک نہیں ہوا تھا، انہوں نے ''زادسفر'' کے نام سے اس کا ترجمہ ذیلی عنوانات اور تشریحی نوٹ کے ساتھ مکمل کردیا، اللہ تعالیٰ نے اس ترجمہ کو ایسا مقبول کیا کہ اب تک اس کے دسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں، ۱۹۴۷ء میں اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت نصیب فرمائی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ان کی کتاب زندگی کا سب سے قیمتی اور سب سے نورانی عنوان، ان کا درد دل، ذوق دعا، ان کے دل کی بے تابی، ان کی آنکھوں کی اشک باری، اور ان کی دن و رات کی آہ وزاری ہے، جو ظاہراً تو ان کے خصوصی حالات کا نتیجہ لیکن حقیقتاً ان کے اظہار بندگی کے لیے سامان غیبی، ان کی ترقی اور رفع درجات کا بہانہ ہے، ذرا ایک مرتبہ رخصت ہونے سے پہلے یہ اشعار تو پڑھئے کہ کس دل سے نکلے ہیں''۔

دریائے رحمت میں کیسا تلاطم پیدا کیا ہوگا، آج بھی دل کے ساکن سمندر میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

کب سے کھڑی ہوں یا رب امید کے سہارے
یہ دن نہ جانے میں نے کس طرح سے گزارے
بے چین ومضطرب دل جاکر کے پکارے
وہ کون ہے جو حالت بگڑی ہوئی سنبھالے

ہے باب یہ کرم کا خالی نہ پھیر یا رب
دینا اگر تجھے ہے پھر کیوں ہے دیر یا رب
کنج قفس سے بدتر اپنا ہے آشیانہ
اس قید بے کسی میں گزرا ہے اک زمانہ
مغموم دل پر یا رب لازم ہے رحم کھانا
کرتی ہوں میں تجھ سے شکایت یہ عاجزانہ
بار الم ہے دل پر طاقت نہیں ہے دل میں
کیوں کر ہو صبر مجھ سے ہمت نہیں ہے دل میں

اس نظم کے دو شعر دل تھام کر اور سن لیجیے:

کب سے لیے کھڑی ہوں میں کاسۂ گدائی
اب تک نہ ملا مجھ کو اور شام ہونے آئی

اور یہ دوسرا شعر ہے، اور کون بڑے سے بڑا صاحب علم اور صاحب درد ہے جو اس شعر کو پڑھ کر بندگی اور عاجزی کا مزا نہ لے۔

بندہ نواز! میری منت کی لاج رکھ لے
میری نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے

اور ایک شعر اور سنئے:

عمر گزری ہے تیرے دربار میں آئے ہوئے
گڑگڑا کے مانگتے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے

اس کی رحمت کا فیصلہ ہوا کہ اپنی اس عاجز، درماندہ، دردمند، پرسوز بندی کو اس دارالمحن سے اس جوار رحمت میں بلا لے جس کے مکینوں کے لیے اس کا ارشاد ہے ﴿لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ﴾ (البقرۃ:۳۸) ۲۸ رجنوری ۱۹۷۶ء کو انتقال ہوا۔

ملفوظات

(۱) ماؤں کو تاکید کرتی تھیں کہ اپنی بچیوں اور بچوں کو پہلے دین کی ہر بات سے

واقف کرادو، قصے کہانیاں بھی کہو تو اس کا لحاظ رکھو کہ کوئی غلط بات نہ کہو۔

(۲) فرماتی تھیں: پہلے اپنے میں اچھائیاں پیدا کرو پھر دوسرے کو نصیحت کرو۔

(۳) پہلے دین کی باتیں بتاتیں پھر سنتیں پھر عورتوں سے فرماتیں: یہ سب اسے (بچہ کو) خود سے نہیں آگیا ہے، یہ سب بتانے سے آیا ہے، اسی طرح اگر آپ اپنے بچوں کو بتائیں تو کون بچہ ہوگا جو نہ سیکھ لے۔

(۴) جو چیز تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوا کرے اس سے کبھی انکار نہ کیا کرو۔

(۵) فرماتی تھیں کہ علم حاصل کرلو، مجھے دیکھو کہ میں نے کس طرح عربی پڑھی، اپنے شوق سے پڑھی، جس سے موقع ملا اس سے پڑھا، بھائی صاحب سے (مولانا عبدالعلی صاحب) علی سے (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) اور جو ملا اس سے پڑھا۔

(۶) فرماتی تھیں: دل مارنے کی عادت ڈالو، جو جی چاہے وہ کرگزرو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔

(۷) غلط بات پر تنبیہ کرتیں، دعاؤں کے یاد کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔

(۸) ان کی یہ نصیحت تھی کہ اگر غیبت کی عادت چھڑانا ہو تو غیبت کے بعد دو رکعت نفل توبہ کی بطور جرمانہ ضرور پڑھ لیا کرو، یہ بری عادت انشاء اللہ جاتی رہے گی۔

(۹) فرماتی تھیں: کبھی کسی سے سوال نہ کرو، صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو وہی ہے دینے والا۔

(۱۰) فرماتی تھیں: سوائے اللہ کے کسی سے امید نہ رکھو، غیبت نہ کرو، برا بھلا نہ کہو صبر میں بڑی بھلائی ہے۔

(۱۱) فرماتی تھیں: دعاؤں کے ذریعہ مدد چاہو یہی دعائیں کام آئیں گی۔

(۱۲) فرماتی تھیں: حدیث پاک میں ہے کہ قرب قیامت میں کوئی چیز مدد نہ دے گی سوائے اللہ کے کلام کے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ساری دعائیں یاد کرنے کی گھر والوں کو تلقین کرتیں۔

(۱۳) مصیبت اور پریشانی کے وقت عذاب الٰہی سے پناہ مانگنے کی تلقین کرتیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
شخصیت کے تشکیلی عناصر

تمہید

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات حسرت آیات پر تعزیتی جلسوں اور مضامین کا ایک سلسلہ چل پڑا، جس نے بعد میں مختلف ماہناموں اور رسالوں کے خاص نمبروں کی شکل اختیار کرلی، حضرت والا کی بلند قامت اور عالی شخصیت کی وصف نگاری اور اہل نظر اور صاحبان علم و دانش ان کی زندگی کے مختلف بلکہ متضاد پہلوؤں کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کرنے لگے، یہ سب کوششیں اپنی جگہ قابل قدر، تمام محنتیں برمحل، مفید و مستحسن اور یہ ساری تحریری کوششیں شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن رہ رہ کر یاد آتی ہے والد ماجد (مولانا سید محمد الحسنیؒ) کی، اگر ان کو اپنے عم نامدار کی سیرت نگاری کا موقع ملتا اور وہ ان کے گوشہائے زندگی پر قلم اٹھاتے تو شاید ایسی تصویر سامنے آتی جس کو دیکھ کر وہ لوگ بھی حضرت والا کو پہچان لیتے جن کو قریب سے دیکھنے یا ان کی خدمت میں بیٹھنے کو موقع نہیں ملا، کیونکہ وہ ایک عزیز قریب اور ادیب ہونے کے ساتھ شاید حضرت والا سے سب سے زیادہ واقفیت اور مناسبت رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کو حضرت کا مثنیٰ کہا جاتا تھا، قلم و تحریر میں ایسی یکسانیت پائی جاتی تھی کہ ایک دوسرے کو الگ محسوس کرنا مشکل ہوتا تھا، حضرت نے یہ واقعہ کئی مرتبہ سنایا کہ میں کچھ لکھ رہا تھا

محمد میاں موجود تھے دوران تحریر ضرورت کے لیے مجھے اٹھ کر جانا پڑا، میں محمد میاں کے سپرد کر کے چلا گیا، جب حضرت لوٹ کر آئے اور اپنے کام کو مکمل کر لیا، نظر ثانی کرنے پر ان کو بھی حیرت ہوئی کہ پیوند کی شناخت مشکل ہوگئی کہ کہاں تک میں نے لکھا اور کہاں سے انھوں نے جوڑ لگایا ہے اور قلم سے قلم ایسا ملا دیا تھا کہ حضرت والا کی خواہش رہتی تھی کہ ان کی تحریروں کا ترجمہ وہی کریں یہ شرف والد صاحب کو حاصل رہا اور حضرت والا کی اہم اور بڑی کتابوں کا ترجمہ انہی کے حصہ میں آیا، مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا، چچا کو بھتیجے پر مضمون لکھنا پڑا وہ عین جوانی میں دنیا سے رخصت ہوگئے، جو "تعمیر حیات" کے خاص نمبروں میں شائع ہوا، اس کے چند سال کے بعد ان کے عزیز اور باصلاحیت بھانجے مولانا محمد ثانی حسنیؒ جن کو سوانح نگاری کا اچھا سلیقہ اور تاریخ کا بڑا ذوق تھا، اور جن کے قلم سے سوانح یوسفی اور حیات خلیل جیسے اہم تذکرے نکل چکے تھے وہ بھی رخصت ہوگئے، حضرت نے اس خلا کو محسوس کر لیا اور خود نوشت سوانح لکھ کر اپنے چاہنے اور استفادہ کرنے والوں کے لیے راہ ہموار کر دی تاکہ اس میں دیئے گئے اشارات وخیالات اور واقعات سے وہ اس تغیر پذیر، انقلاب انگیز اور مشاغل سے پُر زندگی میں راہ پا سکیں، اور جس سے انسانیت کی چارہ جوئی کی سبیل ہاتھ آسکے، ان مشمولات کو سامنے رکھتے ہوئے اور مختلف اوقات اور مواقع پر حضرت والا جو وضاحتیں فرماتے رہے ہیں ان کی روشنی میں حضرت کی شخصیت سازی میں جو چند ابتدائی اور بنیادی عوامل ومحرکات کارفرما رہے ہیں اور چند ذاتی خصوصیات جو ان محرکات وعوامل کا نتیجہ ہیں قارئین کے سامنے پیش کی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ توفیق خاص عطا فرما کر پڑھنے والوں کے لیے نافع بنائے۔

یہ بات تاریخ کے ریکارڈ میں آچکی ہے، زمان ومکان اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو ایسی عالمی شہرت ومقبولیت عطا فرمائی ہے کہ کیا عرب کیا عجم سب آپ کے مداح، شاب وشیخ سب میں یکساں مقبول، کیا دوست، کیا دشمن سب آپ کے معترف، کیا مسلمان، کیا غیر مسلم سب آپ کے مداح وقدرداں، غرض اللہ

تعالیٰ نے دلوں کو مسخر کرنے والی ایسی جاذبیت اور کشش آپ کی شخصیت میں پیدا فرمادی تھی، جو ماضی قریب کی کسی شخصیت میں نظر نہیں آتی ۔

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ عیسائی آ آ کر عرض کرتے تھے ہم نے آپ کے لیے گرجا گھر میں دعائیں کی ہیں، ہمارے حضرت والا کی خدمت میں کثرت سے غیر مسلم آتے، خواہ وہ حکومت سے متعلق ہوں یا عام طبقہ سے، زیارت کرتے، مستفید ہوتے اور برکت حاصل کرتے او بعض تو اللہ کی توفیق سے اسلام بھی قبول کرتے، جب حضرت آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں امریکہ پہنچے تو عیسائی ڈاکٹر نے اپنی فیس کا نہ صرف یہ کہ مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس کے قبول کرنے سے معذرت کردی۔

ان کی اس غیر معمولی محبوبیت اور مقبولیت کا عام راز ان کی وہ صفت تھی جس کو قرآن مجید نے شافع محشر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت قرار دیا ہے، ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّواْ مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ (آل عمران: ۱۵۹)

اخلاق نبوی کا یہ پرتو ان پر اس لیے پڑا تاکہ وہ اس عظیم الشان تجدیدی کام کو انجام دے سکیں، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو چنا تھا تاکہ ساری دنیا میں صحیح اسلامی فکر کی نشرواشاعت ہوسکے اور اس زبردست مغربی سیلاب پر روک لگائی جاسکے جو اس باقی ماندہ ایمانی سرمایہ کو ٹھکانے لگادینے اور اس چنگاری کو بھی بجھادینے کے درپے ہے جس میں اس مادّہ زدہ انسانیت کے لیے سکون وحرارت ہے۔

والدہ صاحبہ کی تربیت

حضرت کی شخصیت سازی میں جو عناصر زیادہ مؤثر رہے ہیں اس میں سب سے اہم کردار ان کی والدہ محترمہ کا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم وتربیت کا خاص ملکہ عطا فرمایا

تھا، ان کو اپنی ہم عصر خواتین میں شعور وسلیقہ اور فہم وفراست میں امتیاز خاص حاصل تھا، وہ حافظ قرآن تھیں، پاکیزہ ادب وشعر کا شوق بھی تھا، خصوصاً حمد ومناجات میں ان کا کلام بڑا مؤثر ہے، عبادت وریاضت میں بھی وہ ممتاز تھیں، خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، اور رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کا شرف واعزاز حاصل کیا۔ وہ ان خوابوں کو ایک کاپی میں محفوظ کر لیتی تھیں جو موجود ہے، ان کے حالات وکمالات کے لیے حضرت مولاناؒ کی کتاب ''ذکر خیر'' کا مطالعہ قارئین کے لیے بہت مفید ہے۔

انہوں نے اپنے فرزند ارجمند کے متعلق معنی خیز اور بشارت آمیز خواب دیکھے جو ان کی تسلی کا ذریعہ بنے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں اس کی تعبیر بھی دکھادی، بعد میں تو ان کے وہ سارے خواب پورے ہوئے جو انہوں دیکھے تھے، وہ نو سال کے تھے کہ ان کے والد محترم کا انتقال ہوگیا اور والدہ صاحبہ نے تربیت شروع کی، ان کی تربیت کا انداز نہایت حقیقت پسندانہ، حکیمانہ، باریک بینی پر مبنی تھا جس کا عکس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے، ان کی تربیت کے چار بنیادی عناصر تھے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

ا- صحیح عقیدہ کی تلقین اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تاکید، عقیدے کی اہمیت کی تلقین ایک خط میں اس طرح کرتی ہیں: علی! دنیا کی حالت نہایت خطرناک ہے، اس وقت عربی حاصل کرنے والوں کا عقیدہ ٹھیک نہیں تو انگریزی والوں سے کیا امید!!

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتی ہیں

''اور جہاں تک ممکن ہو اگلے علماء کی سی لیاقت پیدا کرو اور وہی معلومات حاصل کرو کہ کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہو اور تمام مسئلوں سے بخوبی واقف ہو جاؤ، اس وقت اسی علم کی ضرورت ہے، اس وقت کے علماء کچھ نہیں جانتے اور فتنہ پیدا کرتے ہیں، میری دلی تمنا ہے کہ تم علم میں وہ مرتبہ حاصل کرو جو بڑے بڑے علماء نے حاصل کیا''

۲- دوسری اہم چیز جس کی تخم ریزی انہوں نے اپنے لخت جگر کے نہاں خانہ میں

کی وہ رسول اللہ ﷺ سے محبت وتعلق، اتباع سنت کا جذبہ، نمازوں کا اہتمام، اذکار مسنونہ کی پابندی اور منتخب قرآنی سورتوں کو یاد کرنے کی تاکید تھی، جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ بچپن ہی سے دل کو ذات نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے ایسا والہانہ تعلق اور عشق پیدا ہو گیا جو اس عمر کے بچوں میں ناممکن نہیں تو نادر الوجود ضرور ہے، عربی شاعر نے اس کو بڑے البیلے انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے اس سے محبت ہو گئی جب کہ میں خود محبت سے آشنا نہ تھا، اس طرح اس نے دل کو خالی پا کر اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔

اس محبت کا کچھ اندازہ حضرت مولانا کی مندرجہ ذیل تحریر سے لگایا جا سکتا ہے:

''میں کتابوں کی فہرستوں کو جو مکتبے اکثر شائع کرتے رہتے ہیں ہمیشہ بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا، ایک مرتبہ میری نظر شبلی بک ڈپو لکھنؤ کی فہرست کتب میں ''رحمۃ للعالمین'' پر پڑی، اور میں نے اس کتاب کا آرڈر بھجوا دیا، اس وقت اس کتاب کے دو نسخے چھپے تھے اور ایک بچہ کا محدود بجٹ (جس کی عمر گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہ تھی) اس کتاب کو خریدنے سے یقیناً قاصر تھا، لیکن بچے کے بجٹ اصول وقواعد معاشیات کے ضوابط کے پابند نہیں ہوتے، وہ صرف اپنی تمناؤں اور جذبات کے ساتھ چلتے ہیں''۔

دوسرا مرحلہ کتاب کی بذریعہ ڈاک وصولیابی کا تھا، جس کے ذکر کے بعد وہ کتاب کے مطالعہ کے پہلے تاثر کو یوں بیان کرتے ہیں ''اب میں نے کتاب پڑھنا شروع کی اور کتاب نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا، لیکن یہ کوئی تند و تیز ناگوار اور پریشان کن تحریک نہ تھی، یہ بہت نرم گداز اور روح پرور وجان سوز تحریک تھی، میرا دل خوشی سے اس طرح جھوم اٹھا جیسے باد بہاری سے کوئی شاخ گل جھوم اٹھے اور پھولوں کے بوجھ سے لٹک جائے، میرا دل اس کتاب کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا اور اس نے ایسا لطف لینا شروع کیا جیسے وہ اسی کتاب کے انتظار میں تھا۔

۳- تیسری بات جس میں وہ قطعاً رعایت نہ کرتیں اور اس میں ان کی غیر معمولی محبت حائل نہ ہوتی یہ تھی کہ ''اگر میں خادم کے لڑکے یا کام کاج کرنے والے غریب

بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی یا ناانصافی کرتا یا حقارت اور غرور کے ساتھ پیش آتا تو نہ صرف وہ معافی منگواتیں بلکہ ہاتھ تک جوڑواتیں، اس میں مجھے کتنی ہی ذلت وخفت محسوس ہوتی، مگر اس کے بغیر وہ نہ مانتیں، اس کا مجھے اپنی زندگی میں بڑا فائدہ محسوس ہوا'' حضرت اپنی والدہ ماجدہ کی اس ادا کا بڑی ممنونیت سے تذکرہ فرماتے اور فرماتے اسی تربیت کا نتیجہ ہے مجھے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے اور معافی مانگ لینے میں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا ہے۔(۱)

۴۔چوتھی چیز جس کی والدہ صاحبہ نے پوری نگرانی کی بلکہ خوردبین سے اس کو دیکھتی رہیں وہ یہ کہ رنگ وخون اور نسب پر فخر وتکبر کا جذبہ پروان چڑھنے نہ پائے، نیز اس کے علاوہ دوسری اور قابل ملامت عادتیں پیدا نہ ہوں جیسے مال کی لالچ، حسد، غیبت، چغل خوری آخری چیز جس کا مخدومہ والدہ صاحبہ نے سب سے زیادہ اہتمام کیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کردی، اور وہ ان کی دعائے نیم شبی وآہ سحرگاہی ہے، جو خاص طور سے اپنے ہونہار فرزند کے لیے اور عالم اسلام کے لیے عام طور پر کرتی تھیں، وہ نہایت گریہ وزاری کے ساتھ خدا کے حضور میں متوجہ رہتی تھیں، اور اپنے بیٹے کے لیے جس کی پیشانی پر روشن مستقبل کی چمک تھی، اور ظاہری آثار وقرائن اس کی شہادت دے رہے تھے کہ عنقریب یہ بچہ اعلاء کلمۃ اللہ کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کرے گا، وہ دعائیں کرتیں، یہ دعائیں کبھی کبھی اشعار کی شکل اختیار کرلیتی تھیں، انہوں نے خود اپنی ایک تصنیف میں اپنی دعا کی ترجمانی کی ہے جس سے بہتر ترجمانی نہیں ہوسکتی، حضرت کے سلسلہ میں ان کی والدہ صاحبہ کی بے کلی اور بے چینی دیکھ کر خاندان کی ایک خاتون نے کہا کہ خیر النساء تم چاہتی ہو کہ ابوالحسن نبی ہوجائے؟ انہوں نے کہا نہیں ہرگز نہیں، میں خوب جانتی ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، وہ مستجاب الدعوات خاتون تھیں،

(۱) کاروان زندگی، ج:۱/۸۱

انہوں نے اپنے صاحبزادے کے لیے جو بھی دعائیں کیں وہ اللہ نے قبول کیں۔

''دعا گویا میری غذا تھی، بغیر دعا کئے مجھے سیری نہ ہوتی، دعا کی مشغولیت اتنی بڑھی کہ تمام مشاغل چھوٹ گئے، مگر بات بھی کرتیں تو دعا کے ساتھ کرتیں، کوئی گھڑی دعا سے خالی نہ گزرتی، جمعہ گویا کہ روز عید تھا اور فی الحقیقت عید کا دن بھی ہے، تمام دن دعائیں کرتیں، خاص طور سے عصر سے غروب آفتاب تک تنہا بیٹھ کر دعا میں ایسی مشغول رہتیں کہ کسی طرف آنکھ نہ اٹھاتیں، مرغ کی ہر آواز پر اور ہر اذان کے ساتھ دعا کرتیں، حتی الامکان کوئی وقت دعا کا ضائع نہ کرتیں، اور کوئی بات نہ چھوڑتیں ہر خوف سے امان مانگتیں اور ہر خوبی کی طالب ہوتیں، یہ اس مالک حقیقی کی رحمت وعنایت تھی کہ جو جو معاملات زندگی میں پیش آنے والے تھے دعا کے وقت سب پیش نظر ہو جاتے اور اس قدر جوش پیدا ہو جاتا کہ بے خودی ہو جاتی اور تمام جگہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی اور اس کی شان قدرت پر نظر کر کے تڑپ جاتیں، جس طرح مرغ ذبح تڑپتا ہے، مگر بے خودی میں بھی دعا جاری رہتی اور ہر وقت اپنے قیافہ پر نظر کرتیں اور کہتیں ؎

جو عیب قسمت کے ہیں مٹا دے
ترا ہی عالم میں نام ہوگا

سجدے سے ہرگز سر نہ اٹھاتیں جب تک دل کو تسکین نہ ہو جاتی، فرماتیں کہ دعا کے بعد مجھے اس قدر تسکین ہوتی ہے کہ گویا رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں، اور میں خزانہ رحمت لوٹ رہی ہوں، کبھی خود بخود ہنسی آجاتی۔(۱)

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی دعائیں کرنے کی توفیق دی جو پوری انسانیت اور خاص طور سے عالم اسلام کے لیے باعث خیر وبرکت ثابت ہوئیں، وہ کہتی تھیں ؎

علی راحت ہو سینوں کی
علی ٹھنڈک ہو آنکھوں کی

---

(۱) اسلام میں عورت کا درجہ، ص: ۲۶۰-۲۶۱

ان کی دعاؤں میں یہ بات بھی برابر آتی کہ حضرت عجم کے مقابلے میں عربوں میں زیادہ مقبول ہوں، اور ان کے دلوں میں زیادہ جگہ پائیں، اس کے علاوہ بھی بہت سی دعائیں ہیں، کچھ اشعار کی شکل میں ہیں اور کچھ ان کے مخطوطہ "الدعاء والقدر" میں موجود ہیں۔(۱)

مربی اور مشفق برادر اکبر کی تربیت

والدہ ماجدہ کی توفیق الٰہی پر مبنی تربیت وکفالت کے ساتھ رب کریم نے برادر اکبر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی صورت میں ایسا مربی وشفیق اتالیق عطا فرمادیا جو ایک طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سند یافتہ، حضرت شیخ الہند اور مولانا انورشاہ کشمیری کے شاگرد تھے، تو دوسری طرف عصری علوم میں فن طب میں دستگاہ کامل رکھنے والے (M.B.B.S.) ڈاکٹر جن کو اللہ تعالیٰ نے اعتدال وتوازن، باریک بینی، بلند نظری، مسلمانان عالم سے آگاہی اور ان کے مسائل سے دلچسپی جیسی اعلیٰ صفات عطا فرمائی تھی، ان کی دوررس نگاہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اللہ نے ان کے بھائی کو جوہر قابل عطا فرمایا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ان کی صلاحیتوں کا رخ متعین کیا جائے، ان کا صحیح استعمال ہو، چنانچہ انہوں نے ابتدائی ایام میں دو باتوں کا خاص اہتمام رکھا، حضرت کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں "ایک یہ کہ نماز جماعت کے ساتھ پابندی سے پڑھتا رہوں، کبھی ایسا ہوا کہ وہ میڈیکل کالج سے واپس آئے، واپسی بالعموم مغرب کے بعد ہوتی تھی، پوچھا کہ ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں پڑھیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، ان کو کچھ شبہ ہوا تو تینوں نمازیں دوبارہ پڑھوائیں، دوسرے یہ کہ ملازموں کے ساتھ زیادہ نہ بیٹھوں، اور بے تکلف نہ ہوں، نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ کسی سے لے کر نہ پڑھوں۔(۲)

خاندانی روایات اور ورثہ کا تقاضہ بھی تھا کہ حضرت فارسی کی تکمیل کرتے اور اس میں مہارت پیدا کرتے، والد اور دادا دونوں فارسی زبان کے ماہر تھے، لیکن ڈاکٹر

(۱) کاروان زندگی، ج:۱/۸۷ (۲) کاروان زندگی، ج:۱/۹۱

صاحب نے فارسی زبان میں زیادہ وقت صرف کرنے کے بجائے عربی زبان کی تعلیم کے لیے اپنے دوست اور عربی زبان کے بے مثال استاد شیخ خلیل بن محمد حسین یمنی کے پاس بھیجا، دوسری طرف انہوں نے ایک انگریزی ریڈر شروع کرادی، اس سے ایک طرف ڈاکٹر صاحب کی زمانہ شناسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان میں فارسی کا ورق الٹ رہا ہے، دوسری طرف دوررس نگاہوں کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو دعوت وتبلیغ کے لیے خاص طور پر عالم اسلام کے لیے (جس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے) کس طرح تیار کررہے تھے، زمانہ کے طرز سے بالکل ہٹ کر انہوں نے ایک نیا طریقہ تعلیم اختیار کیا۔

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کریں گے
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

حضرت مولاناؒ اپنے استاذ کے عربی پڑھانے کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے ان کو صرف عربی کا ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ بھی حاصل تھا، حضرت جب بھی ان کی تدریس کا طریقہ بیان کرتے تو خود حضرت ان اشعار کو بڑے مزے لے کر پڑھتے تھے جن کو پڑھاتے وقت استاد محترم پر کیف طاری ہوجایا کرتا تھا، تحریر فرماتے ہیں: عربی زبان وادب کا ذوق سلیم وذوق صحیح پھر اس ذوق کے منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحبؒ میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی وادبی حلقوں میں بھی شاذ ونادر ہی شاید پائی جائے۔

اللہ تعالیٰ کو حضرت سے عالم عرب میں کام لینا منظور تھا اس لیے ضروری تھا کہ ان کی زبان ایسی صاف وستھری، شگفتہ وشیریں ہو جو عربوں کے ذوق کو اپیل کرسکے۔ کیونکہ اہل عرب اس بارے میں بڑے حساس واقع ہوئے ہیں، اس کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ عربی ادب وزبان کے ممتاز ومتفق علیہ محقق علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی ندوہ تشریف لے آئے، حضرت مولانا ان کی آمد کا نقشہ کھینچتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اسی زمانہ کا ایک اہم، بلکہ تاریخ ساز واقعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان وادب کے

محقق عالم، علم آموز اور ذوق آفریں استاد علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد ہے، علامہ موصوف ان گنے چنے اساتذہ اور فضلاء میں ہیں جو سند کا درجہ رکھتے ہیں، دوسری جگہ لکھتے ہیں ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان وادب کے بہت سے مبادی اور بدیہیات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق واصول، نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے اور عجمیت وہندیت کے اثر سے کلیۃً آزادی نصیب نہ ہوتی۔(۱)

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک انگریزی ریڈر بھی شروع کرادی تھی، اس طرح انگریزی تعلیم کا سلسلہ آہستہ آہستہ عربی کے ساتھ جاری رہا، لیکن دعوتی میدان میں کام لینے اور تاریخ وغیرہ کی کتابوں کو براہ راست سمجھنے کے لیے جس کی استعداد کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سلسلہ سے پیدا نہیں ہوسکتی تھی، اس کا غیبی انتظام یہ ہوا اگر چہ ظاہر میں انگریزی زبان کا اقبال رہا ہو یا بعض افراد خاندان کا یورپ وامریکا سے بڑی اور اعلی ڈگریوں کا حصول، حضرت کا دل انگریزی زبان کی طرف ایسا مائل ہوا کہ خود حضرت لکھتے ہیں ''یہی وہ زمانہ تھا جب مجھ پر انگریزی پڑھنے کا دورہ پڑا اور اس کا بخار چڑھا- آگے لکھتے ہیں- اپنے شوق سے انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابیں (جواب شاید B.A. کے معیار کی ہوں گی) ڈکشنری سے حل کر کے مطالعہ کرنے لگا، ابھی امتحان میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدہ صاحبہ کو (غالباً بھائی صاحب کے ذریعہ) میرے اس انہماک کا علم ہوا، انہوں نے مجھے بڑا مؤثر اور دردمندانہ خط لکھا، جس کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو تو ان سبھوں پر نظر کرو، جنہوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، ان کے مرتبے کیا تھے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، مولوی محمد ابراہیم صاحبؒ اور تمہارے بزرگوں میں خواجہ احمد صاحب نصیر آبادیؒ اور مولوی محمد امین صاحب نصیر آبادیؒ جن کی زندگی اور موت قابل

(۱) مشاہیر اہل علم ص: ۱۶۸

رشک ہوئی، کس شان وشوکت کے ساتھ دنیا برتی اور کیسی کیسی خوبیوں کے ساتھ رحلت فرمائی، یہ مرتبے کیسے حاصل ہوسکتے ہیں، انگریزی مرتبہ والے تمہارے خاندان میں بہت ہیں اور ہوں گے، مگر اس مرتبہ کا کوئی نہیں، اس وقت بہت ضرورت ہے، ان کو انگریزی سے کوئی انس نہ تھا، یہ انگریزی میں جاہل تھے، یہ مرتبہ کیوں حاصل ہوا، علی! اگر میرے سواولادیں ہوتیں، تو سب کو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین۔(۱)

آگے تحریر فرماتے ہیں: میرا دل اچانک انگریزی کی مزید تعلیم سے اچاٹ ہو گیا، مگر اس غیر معتدل اور بحرانی مصروفیت کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے وقت میں میں نے ضروری استعداد پیدا کرلی، اور اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں اور بعد میں انگلستان وامریکا کے سفر میں اس سے کام لے سکا، اور اس سے ابھی تک فائدہ اٹھا تا رہا ہوں، دوسری طرف حضرت ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ حضرت مولانا کا حضرت سید احمد شہیدؒ کی ذات اور ان کی سیرت ودعوت سے تعلق پیدا ہوجائے جس کے دو سبب ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ سیرت سازی میں سیرت وسوانح کو بہت دخل ہے جو صحبت کا بدل بھی ہے، جب کہ اس کا تعلق خاندانی بھی ہو اور روحانی بھی۔

دوسرا سبب غالباً یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو حضرت سید احمد صاحبؒ سے غایت درجہ عقیدت ومحبت تھی حضرت مولاناؒ نے اپنی مجلسوں میں کئی مرتبہ یا ہم لوگوں کے سامنے خاص طور پر فرمایا کہ بھائی صاحب کو غالباً صحابہ کرام کے بعد حضرت سید احمد صاحبؒ سے سب سے زیادہ تعلق تھا۔

اس تعلق کو استوار کرنے کے لیے وہ طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے تھے، عربی زبان سیکھ لینے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب نے ''توحید'' پرچہ میں (جوامرتسر سے

---

(۱) کاروان زندگی، ج:۱/۱۲۲-۱۲۳ باختصار

شائع ہوتا تھا) سید صاحبؒ پر شائع شدہ مضمون کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، جو بعد میں مصر کے پرچہ ''المنار'' میں شائع ہوا، مزید برآں یہ کہ علامہ رشید رضا نے الگ رسالہ کی شکل میں مصر سے شائع کیا، جس پر حضرت کو بڑی خوشی اور مسرت ہوئی۔(۱)

ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ طریقۂ تربیت تیر بہدف ثابت ہوا، اس رسالہ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات کے مطالعہ کا مبارک سلسلہ شروع ہوا، اس نے کیا اثر ڈالا اس کے لیے مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ کی چند سطریں آپ بھی پڑھتے چلئے، ''کیفیات ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بار بار چلے ہیں، لیکن ایمان ویقین اور خلوص وللّٰہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس سے پہلے نہیں چلی، نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیانہ پر عزم وتوکل، جوش وجہاد، ایمان واحتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں ملے، آدم گری ومردم سازی، اصلاح وانقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔'' اسی کے نتیجہ میں حضرت کے اشہب قلم سے وہ بے نظیر کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) وجود میں آئی جس کو ہندوستان کے دینی حلقوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، جس طرح ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' عرب دنیا میں حضرت کے تعارف کا ذریعہ بنی اسی طرح ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' ہندوستان میں حضرت کے تعارف کا ذریعہ بنی، حضرت لکھتے ہیں:

''یہ بڑا مبارک آغاز تھا اور اس سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، مجھے خود اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ اقدام خود میری زندگی میں انقلاب انگیز بلکہ عہد آفریں ثابت ہوگا، اور یہ کتاب ہندوستان میں اتنی مقبول اور دینی حلقوں میں میرے تعارف اور بزرگوں کے یہاں قرب کا ذریعہ بنے گی، بقول شاعر

حکایات از قد آں یار دل نو از کنیم
بایں بہانہ مگر عمر خود دراز کنیم

(۱) کاروان زندگی، ج:۱/۱۱۹

اس مطالعہ وانہماک کا اثر یہ بھی ہوا کہ حضرت سید صاحب کی شخصیت حضرت مولانا کے ذہن ودماغ پر چھا گئی، اور دل کی گہرائیوں میں اتر گئی، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وہ چیز جس کا انتساب سید صاحب کی طرف ہو حضرت والا کو محبوب اور پسندیدہ معلوم ہوتی تھی، حضرت سید صاحب کے بعض خاندانی افراد واقعۂ بالاکوٹ کے بعد والیٔ ٹونک کے اصرار پر ٹونک میں مقیم ہو گئے تھے، اس لیے ٹونک سے اور ٹونک والوں سے ایک والہانہ تعلق قائم ہو گیا، یوں بھی عام اہل مجلس جانتے تھے کہ حضرت والا کیسے ہی خاموش اور متفکر ہوں اگر سید صاحب کا تذکرہ کر دیا جاتا تو ایک دم سے محفل کا رنگ بدل جاتا، مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت والا ایک مرتبہ ٹونک تشریف لے گئے، مجھے بھی معیت کی سعادت حاصل تھی، جے پور سے حضرت مفتی احمد حسن صاحب کی گاڑی میں قافلہ ٹونک کے لیے روانہ ہوا، حضرت نے فرمایا کہ جب ٹونک کی سرحد آئے تو بتا دینا، تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب نے اطلاع دی کہ وہ دیکھئے ٹونک کی سرحد پر موٹر پہنچنے والی ہے، یہ سنتے ہی حضرت تیار ہو گئے اور جیسے ہی ٹونک کی سرحد میں موٹر داخل ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ ایک برقی روح حضرت کے اندر دوڑ گئی، اور نہایت ہی والہانہ اور پر کیف لہجہ میں یہ اشعار پڑھنے شروع کئے۔

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خاک کچھ باقی
بتاتا باغباں رو رو کے یہاں غنچہ یہاں گل تھا

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اعلان کر دیا یہاں کوئی پابندی نہیں جو چاہے اپنے گھر لے جائے اور جہاں چاہے تقریر کروالے، اہالیان ٹونک کی بن آئی، جس کو دیکھو لیے جا رہا ہے، اور حضرت چلے جا رہے ہیں، یہاں وعظ وبیان سے شاید کوئی محلہ محروم رہا ہو، آخر میں حضرت پر اس تعب کا اثر یہ ہوا کہ بخار آ گیا، پھر قافلہ کی مسجد اور قافلہ کے محلہ سے تو حضرت کو عشق تھا، مسجد تو خیر بار بار جانا ہوا، اس محلہ میں جہاں حضرت سید صاحب کے

لوگ آکر بسے تھے (اگرچہ اس وقت کوئی نہیں تھا کیونکہ وہ سب پاکستان منتقل ہو چکے تھے) حضرت تشریف لے گئے، دور سے کھڑے ہو کر کلومیاں کی حویلی دکھائی، (جواب غیروں کے قبضہ میں تھی) اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے خاص طور سے وہ کمرہ دکھایا جس میں حضرت قیام فرما چکے تھے اور ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاص انداز سے فرمایا، یہیں خواب میں حضرت سید صاحبؒ کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔

حضرت رحمہ اللہ کا یہ جذبہ والہانہ تاحیات قائم رہا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بڑھ گیا تھا تو مبالغہ نہ ہوگا، سید صاحب کے مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ، بالاکوٹ کے واقعات کا ذکر اور ان کے اصلاحی وتجدیدی کاموں کی نشاندہی حضرت والا کا پسندیدہ اور محبوب موضوع بنا رہا۔

دوسری طرف ڈاکٹر صاحب نے سیرت کی تکمیل اور اس کو بامقصد بنانے کے لیے اپنے وقت کے بزرگان دین اور مشائخ ربانی کی خدمت میں وقت گزارنے کی تاکید کی، جس پر عمل کیا گیا، (جو مستقل موضوع چاہتا ہے) اس حکیمانہ تربیت، مشفقانہ اتالیقی اور نظر کیمیا اثر کے نتیجہ میں حضرت والا کے اندر عنفوان شباب میں وہ باتیں پیدا ہوگئیں جو عام طور سے پائی نہیں جاتیں اور اگر پیدا بھی ہوتی ہیں تو بڑے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد، جن میں سے چند باتیں ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

چند خصوصیتیں

مسلمانوں کے معاملات سے غیر معمولی دلچسپی ان کے کھوئے ہوئے منصب ومقام کو یاد دلانا بلکہ اس تذکیر کی ہمہ وقت فکر، اس کے لیے ہر طرح تیار رہنا، جان ومال کی قربانی، راحت وآرام اور وقت کی قربانی سے دریغ نہ کرنا، حضرت والاؒ مضطرب اور بے چین رہتے کہ کس طرح انحرافات کا شکار اور خرافات میں گرفتار امت کو اس سے نکالا جائے، اور اس کو ایمان کی حلاوت وکیفیت سے آشنا کیا جائے، جاہ ومال کے جال میں پھنسے قدم کو کیسے چھٹکارا دلایا جائے، اور راہ قربانی کے لیے کس طرح ہموار کیا جائے، دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ فکر وسوچ میں مبتلا ہیں، راتیں گزر رہی ہیں اور نیند غائب ہے، اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نہایت عاجزانہ، نیازمندانہ لہجہ اور گلوگیر آواز میں

بار بار دہرا رہے ہیں، مولای انی الی فضلك لفقير أي فقير، اے میرے مولیٰ میں آپ کے فضل کا بڑا ہی محتاج ہوں، مجھ سے زیادہ محتاج کون ہوگا؟

اسلام کی سربلندی اور اہل اسلام کی بہی خواہی کے لیے جو کوششیں ہوسکتی ہیں اور جو جو طریقے اپنائے جاسکتے ہیں، ان میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی روا نہیں رکھی بلکہ خیر خواہی کا حق ادا کردیا جس کا حضرت والا کو احساس تھا اور آپ وقتاً فوقتاً یہ بھی فرماتے، اللھم فاشھد، اے اللہ تو گواہ ہے۔

دوسری بات جس کی آپ کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی، جس کو زندگی کی روح اور اعمال کا لب لباب قرار دیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ تمام اعمال نیت کے استحضار اور احتسابی روح کے ساتھ انجام دیئے جائیں، اس کی آپ کو بہت فکر رہتی تھی، نہ اس میں چھوٹے اور بڑے اعمال کی قید تھی، نہ دنیوی اور دینی امور میں تفریق اور نہ اپنے پرائے دوست ودشمن کا خیال رہتا، جس کا اظہار کبھی آپ اپنے نیاز مندوں اور شاگردوں سے کردیتے، کبھی اس سلسلہ کے مؤثر واقعات سناتے، خاص طور سے حضرت سید احمد شہیدؒ کا ایک مقولہ ضرور سناتے کیونکہ وہ خود حضرت کا حال تھا، ایک موقع سے حضرت سید صاحبؒ نے فرمایا کہ کوئی کام میں نے شعور سے لے کر اس وقت تک عادی امور کو بھی بغیر ثواب کی نیت کے نہیں کیا۔

حضرت فرماتے تھے اس زمانہ میں اس کی فکر بہت کم ہوگئی ہے، نیز یہ بھی فرماتے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ بدنیت ہوگئے ہیں، بدگمانی نہیں کرتا، لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ بے نیت ہوگئے ہیں، بڑے سے بڑا اور اعلیٰ سے اعلیٰ کام کریں گے لیکن کوئی نیت نہیں اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

اس پاکی قلب، تزکیہ نفس اور استحضار نیت کا نتیجہ تھا کہ آپ کے اندر گروہی عصبیت جماعتی تعصب نہیں پیدا ہوا، نہ آپ کسی جماعت میں ضم ہوکر اس کا کل پرزہ بنے، اور نہ خود ہی کوئی جماعت بنائی، بلکہ آپ کا اصول یہ رہا کہ ہر جماعت کی اچھائیوں اور محاسن کو سراہا، اور جماعت والوں کو ان کے اپنانے اور ان کو بڑھانے کی تاکید کی اور جو کمزور پہلو دیکھنے میں آئے اور کمزوریاں نظر آئیں، ان کی نشاندہی ایسے

خوبصورت اسلوب اور پیرایہ میں اور ایسے اخلاص اور خیر خواہی کے جذبہ سے کی کہ ذمہ داروں نے سنا ہی نہیں بلکہ مانا اور جذبہ اور زبان کی قدر کی اور اعتراف کیا۔

تیسری بات جس پر پوری زندگی عمل پیرا رہے وہ کسی کی دل آزاری سے پرہیز اور انسانیت کا احترام اور اس کا احساس کہ ان کی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچے، دل دکھانا تو آپ نے جانا ہی نہیں ہر ایک کا دل رکھنا، چاہے خود پر کچھ گزر جائے، اس طرح کے امتحانات دن رات پیش آتے رہتے تھے، ایک مرتبہ رائے بریلی سے تشریف لائے سامان ابھی کھولا نہیں گیا تھا، تکان کا پورا اثر تھا ایک صاحب نے آکر کہا کہ آج جلسہ میں شرکت کا وعدہ کیا گیا تھا اگر جانا نہ ہوسکا تو بڑی تکلیف ہوجائے گی اور جذبات مجروح ہوں گے، فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

ہر ایک کا احترام ملحوظ رکھتے، چھوٹا ہو یا بڑا، دور کا ہو یا نزدیک کا، اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے ساتھ درجہ بدرجہ احترام اور اکرام کا معاملہ فرماتے، جس میں مرتبہ اور نسبت کا خاص خیال رکھتے، خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، جس کی بنیاد پر ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ اس کو ہی زیادہ چاہتے ہیں، ایک تعداد مغالطہ کی حد تک اس پر یقین رکھتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے اسی صفت نبوی کو دیکھتے ہوئے یہ دریافت کرلیا کہ آپ مجھے زیادہ چاہتے ہیں یا ابوبکر کو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر کو، اسی طرح عمر کو، پھر عثمان کو، اس پر وہ خود خاموش ہوگئے کہ میرا نمبر آخر میں نہ چلا جائے۔

اس احترام انسانیت کی وجہ سے آپ نے یہ عادت ڈال لی تھی کہ کسی کے سامنے پیر نہ دراز کریں اس میں بھی چھوٹے بڑے کی تفریق نہ تھی، سوائے بیماری کے ایام کے کبھی بھی کسی کے سامنے پیر پھیلاتے نہیں دیکھا، اور نہ کبھی پالتی مار کر بیٹھتے دیکھا، جب بیٹھتے دوزانو بیٹھتے، چار چار، پانچ پانچ گھنٹے مسلسل بیٹھنا ہوتا لیکن تھوڑی دیر کے لیے بھی پالتی نہ مارتے، پہلو ضرور بدل لیتے، میں نے تیس سال سے زائد عرصہ میں حضرت کے علاوہ کسی کو اس طرح اس پر عمل پیرا نہیں دیکھا۔ والعلم عند اللہ

اپنوں کا دل دکھانا تو بہت دور کی بات ہے اپنے مخالفین کی دل شکنی گوارا نہ تھی، بلکہ برابر یہ بات مشاہدہ میں آتی رہی کہ بعض وہ لوگ جو آپ کو برا بھلا کہتے، آپ کی مخالفت

کرتے اور آپ کی شان میں گستاخی کرتے اور نقصان بھی پہنچانے کے درپے رہتے، ان کے ساتھ اکرام واحترام کا معاملہ مزید بڑھتا جاتا، بلکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ جس نے سامنے آکر بھی درشت لہجے میں بات کی اور اہل مجلس کو جس پر بہت غصہ بھی آیا، لیکن حضرت نے معاً بعد ہدایا اور تحائف سے ان کو نوازا، اس سلسلہ میں اپنے مزاج اور مذاق کو بتانے کے لیے دو واقعے سنایا کرتے تھے، ایک حضرت سید احمد شہیدؒ کا۔

ہندوستان کے بعض نامعقول حضرات نے سید صاحب کے خلاف ایک فتوی تیار کیا جو سارے ہندوستان میں پھیلایا گیا ایک نقل سید صاحب کو بھی موصول ہوئی حضرت نے مولانا اسماعیل شہیدؒ کو بلا کر وہ دکھایا، اور پھر فرمایا کہ مجاہدین کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے، کیونکہ بعضے بعضے لشکر میں ایسے مستجاب الدعوات ہیں کہ اگر کہیں ان کی زبان سے ان حضرات کے خلاف بد دعا نکل گئی تو ان کے خاندانوں کو بہت نقصان کا اندیشہ ہے، میں نہیں چاہتا کہ میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچے۔

دوسرا واقعہ جگر صاحب کا سناتے تھے، فرمایا کہ جگر صاحب ایک جگہ قیام پذیر تھے، انہوں نے اپنی شیروانی اتار کر ٹانگ دی، ایک صاحب اٹھے اور یہ سمجھ کر کہ جگر دیکھ نہیں رہے ہیں جیب سے روپئے نکال لیے، جگر صاحب کی نظر پڑ گئی، لیکن انہوں نے نظر انداز کیا، ایک دوسرے صاحب نے ان کو دیکھ لیا تھا انہوں نے جگر صاحب کو آگاہ کرنا چاہا، جگر صاحب نے اشارے سے خاموش کر دیا، بعد میں ان کے استفسار پر فرمایا کہ بھائی میں نے بھی دیکھ لیا تھا، لیکن اظہار اس لیے نامناسب سمجھا کہ یہ جان کر کہ مجھے اطلاع ہوگئی ہے اس کو جس ندامت وشرمندگی کا احساس ہوگا میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا، اس کے مقابلہ میں مال کی کوئی حقیقت نہیں۔

چوتھی بات جو حضرت کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اپنی زبان پر قابو اور اس کی حفاظت ہے، ان کے ہم عمر ساتھیوں کا بیان ہے کہ ان کا شروع ہی سے اس پر عمل تھا، غیبت وغیرہ سے خود بھی پرہیز کرتے، اور غیبت کی مجلس میں شرکت بھی گوارا نہ تھی، اگر ساتھی غیبت میں مبتلا ہوتے تو اس انداز سے اس کا موضوع سخن بدل دیتے کہ معلوم بھی نہ ہوتا اور غیبت سے بھی سب محفوظ رہتے، ایسا انداز اختیار نہ کرتے جس سے لوگ کہہ

سکیں کہ بزرگ بنتے ہیں، نہ ایسی ادا اپناتے کہ لوگ سمجھیں کہ آپ بڑے دیندار ہیں۔

ان کے مربی برادر اکبر اپنے پورے خاندان میں اس سلسلہ میں بے مثال تھے، ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ لایعنی ان کی زبان سے نکلتا ہی نہ تھا، گھنٹوں لوگ ملتے جلتے لیکن کیا مجال ہے کہ زبان ناپاک ہو، اس کا پورا اثر حضرت مولانا پر پڑا تھا، اور شرم وحیاء کی صفت ایسی تھی کہ مذاق میں بھی کبھی زبان پر کوئی بے حیائی کا کلمہ جاری نہیں ہوا، بلکہ یہ بات اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ توبہ کراتے وقت جب یہ جملہ کہلواتے کہ "میں توبہ کرتا ہوں زنا سے" تو آواز دھیمی ہو جاتی ہے اور حیا کی لکیر پیشانی پر ابھر آتی، اور عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ لفظ نہ کہتے بلکہ یوں کہلواتے "توبہ کرتے ہیں بے حیائی کے کاموں سے"۔

غرض کہ آپ کی خلوت وجلوت، آپ کی مجلس ومحفل یکساں طور پر علم وآگہی، حلم وبردباری اور شرم وحیاء سے معمور ہوتی، نہ اس میں عزتیں پامال ہوتیں، نہ لوگوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا تذکرہ ہوتا، نہ لعن طعن کی نوبت آتی، نہ زبان نازیبا کلمات سے آلودہ ہوتی۔

گھر کی خواتین سے ملنے گھر تشریف لے جاتے، خاص طور سے اپنی بڑی ہمشیرہ کی خدمت میں روز ہی جانا ہوتا، افراد وخاندان کا ذکر ہوتا، ان کے اچھے اور پسندیدہ اوصاف کا تذکرہ فرماتے، ایک رحمت وسکینت کی کیفیت پوری مجلس پر طاری رہتی، بچے بھی سب جمع ہو جاتے، آپ سب کو ٹافیاں تقسیم کرتے، ایک ایک بچہ آ کر سلام کرتا، اور ٹافی لے جاتا۔

گھر کی خواتین کے درمیان آپ تشریف رکھتے، آپ کی نشست وبرخاست اور طرز تکلم سے حیاء وشرم کی ایسی جھلک محسوس ہوتی کہ رسول اللہ ﷺ کا وصف حیا کو شمائل میں ذکر کیا گیا ہے یاد آ جاتا کہ اللہ کے رسول ﷺ اس لڑکی سے جس نے باہر کی ہوا بھی نہ دیکھی ہو زیادہ شرم کرنے والے تھے۔

اس طرح ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی گذار کر دنیا سے رخصت ہوئے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں مقام دے اور ان کے کاموں کو قبول فرما کر قیامت تک کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

حضرت مولاناؒ اور تصوف وسلوک

تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جن حضرات کو اس کے صحیح حاملین اور اس راہ کے معتبر اور صحیح رہنماؤں کی صحبت وزیارت کی توفیق نہیں ہوسکی، ان کے سامنے تصوف کی اصطلاح ایک معمہ اور چیستاں بن کر رہ گئی، اور اس کے پس پردہ ایک ایسا خرافاتی نظام نظر آنے لگا جو روح شریعت سے متصادم اور کتاب وسنت کا متوازی نظام تھا جو ظاہر ہے کوئی توحید کا متوالا اور سنت کا شیدائی، غیرت ایمانی اور حمیت اسلامی رکھنے والا انسان برداشت نہیں کرسکتا اور نہ کرنا چاہیے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے:

''اس صورت حال سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح ''تصوف'' نے دین کی کتنی عظیم، کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے۔''

اس کے آگے مزید وضاحت کرتے ہوئے اس چیز کا ذکر فرماتے ہیں جس نے خاص طور سے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کردیا ہے۔

''وہ پیشہ ور اور جاہ طلب وحقیقت فروش اور الحاد شعار اور فاسد عقیدہ، نام نہاد صوفی ہیں جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی وبے قیدی کی تبلیغ

کرنے کے لیے تصوف کو آلہ کار بنایا اور اس کے محافظ وعلمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا اہل غیرت و اہل حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے نا آشنا تھے، وہ مقصد و وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے، بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا، اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا، اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور اس کو فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود مطلوب سمجھ بیٹھے۔"(۱)

اس سلسلہ میں ان حضرات کو جنہوں نے اس شعبہ سے بالکل ہی گریز اختیار کر لیا مشورہ دیتے ہیں

"بہر حال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے، اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے اور قیود واصطلاحات اور خواہشات وتعصّبات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروج نام کی وجہ سے گریز اختیار کرنے لگیں۔"

حضرت نے تصوف وسلوک کو ایک الہامی نظام قرار دیا ہے اور مثالیں دے کر اس کی خوب وضاحت فرمائی ہے، اذان کی خواب میں تلقین، لیلۃ القدر کا طاق راتوں میں دیکھنا، تراویح کا اجتماعی نظام، قرآن مجید کا مصاحف میں جمع کرنا، قرن اول وثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کی جمع وتدوین کا کام، مجتہدین کا استنباط، علم نحو وقرأت، اصول فقہ، اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر واشاعت وغیرہ، ان مثالوں کو قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر فرمانے کے بعد رقم طراز ہیں:

(۱) تزکیہ واحسان، ص:۱۵-۱۶

''تزکیہ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم وفن کی شکل اختیار کرلی، نفس وشیطان کے مکائد کی نشاندہی، نفسانی واخلاقی برائیوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے ذرائع وطرق کی تشریح وتربیت جس کی اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے ماثور وشرعی الفاظ میں پہلے سے موجود تھے، اور جس کا عرفی واصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں ''تصوف'' پڑ گیا، اس اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے۔''

اس تربیت گاہ سے جو حضرات تیار ہوکر میدان میں آئے اور تواریخ میں قائدانہ کردار ادا کیا، ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کرے گا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔''(۱)

ایک جگہ اس شعبہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تامل قبول کرتے، کہ وہ شریعت کی روح، دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی جائے اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہوسکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہوسکتی، اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آسکتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور جو صاف تعلیم کتاب وحکمت وغیرہ کے بیان کئے گئے ہیں، ان اوصاف میں رسول اللہ

---

(۱) تزکیہ واحسان، ص: ۲۹-۳۰

صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت ''تزکیہ'' ہے''۔

تزکیہ کا مطلب کیا ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کس طرح عمل کیا اور کیا اثرات مرتب ہوئے ؟ حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف پڑھ کر سنا دینے اور سمجھا دینے پر اکتفاء نہیں کرتے، بلکہ اس کی تلاوت تعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں، اس کتاب وتعلیم کو ان کے کانوں اور دماغوں سے گزار کران کے قلوب وارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے جاری کردیتے ہیں۔''

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سب سے کامیاب ہادی ومرشد تھے، صحابہ کی حیرت انگیز روحانی، اخلاقی، ذہنی، عملی تبدیلی، اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ آگے تحریر فرماتے ہیں۔ تزکیہ کرنے والے آپ کی امت کے وہ اہل دل اور صاحب حال بزرگ ہیں جو آپ کے انفاس وانوار کے وارث وحامل ہیں، انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کے لیے اور ان کی برکات پہنچانے کے لیے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب وحکمت کی تعلیم، یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ تعلیم ہے وہ تربیت اور تکمیل انسانیت کے لیے دونوں کی ضرورت ہے۔

تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود اسی طرح محسوس ہوتی ہے، جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے ع

زباں گو صاف ہوجاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

روز بروز یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتی ع

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور امت کی اصلاح میں اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا، دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا۔(۱)

اس مرتبہ احسان کی اہمیت وعظمت کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "مرتبہ احسان جو نقد جان بلکہ دولت کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے۔ ؎

متاع وصل جاناں بس گراں است
گرایں سودہ بحال بودے چہ پودے

احسان سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لیے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہیے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہیے۔(۲)

اہل دل کی خدمت میں

یہ وہ شعبہ ہے جس کا تعلق قال سے کم حال سے زیادہ ہے یہ شنیدن سے زیادہ چشیدن ہے، یہاں کام قلب بریاں اور چشم گریاں کا ہے نہ کہ عقل حیراں اور فکر پریشاں کا، یہ مشاہداتی اطمینان وسکون ہے نہ کہ اخباری معلومات اور نظری تخیلات، یہ سراپا عشق ہے جس سے اخلاص کے سوتے جاری ہوتے ہیں، علامہ اقبال نے اس کو یوں بیان کیا ہے ؎

سِرّ دیں مارا خبر اور انظر
او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش
اوز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش

اس فن کے ماہرین نے اس مقام پر فائز ہونے کے لیے چند امور کی بہت تاکید کی ہے جن میں سے تین بہت اہم اور بنیادی سمجھے گئے ہیں، ۱-صحبت محبت کے ساتھ، ۲-کثرت ذکر، ۳-خودرائی سے مکمل پرہیز۔

(۱) سیرت سید احمد شہیدؒ، ص:۲۶۸، طبع ثانی (۲) تزکیہ واحسان، ص:۱۷

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی خدمت میں

اللہ والوں کی صحبت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو شروع سے حاصل رہی ہے، خاندان میں بھی ایسے حضرات موجود تھے جن کی صحبت سے استفادہ جاری تھا لیکن جس شخصیت کا اثر پڑا اور اس کی صحبت زندگی میں تبدیلی کا سبب بنی، وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی ذات گرامی ہے، مولانا نے کوچہ یار کی دریافت اور کیفیات ایمانی واحسانی کی یافت کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے قارئین کو بھی اس نعمت بے بہا اور دولت سرمدی کی طلب پیدا کرنے اور اس کے لیے سعی کرنے کی تلقین کی ہے۔

''میری زندگی کا وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے نیاز حاصل ہوا، اگر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہر حال میری موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی اور شاید اس میں ادب وتاریخ اور تصنیف وتالیف کے سوا کوئی ذوق ورجحان نہ پایا جاتا، خداشناسی اور خدارسی، راہ یابی وراست روی تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خداطلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردان خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح وتکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا، اور ہم عامیوں کے لیے یہی بڑی دولت ونعمت ہے، بلکہ بعض حقیقت شناسوں کے نزدیک یہی اصل دولت ہے۔'' (۱)

اس تعلق کے بعد اپنے روحانی استفادہ کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''میرا روحانی ربط اور مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور ان کو بھی میرے حال پر وہ شفقت وعنایت رہی جس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوتا ہے، ۱۹۴۶ء میں جب وہ سفر حج سے واپس آئے تو میں نے تہنیت کا خط

(۱) پرانے چراغ: ۱۱۷

لکھا مولانا نے اس کے جواب میں مجھے لاہور بلایا، میں ہوشیار پور، جالندھر ٹھہرتا ہوا لاہور حاضر ہوا مولانا نے ایک روز تنہائی میں مجھے اپنے سلسلہ قادریہ میں اجازت مرحمت فرمائی، اور اس کے لیے استخارہ و دعا کا انہوں نے جو غیر معمولی اہتمام مسجد خیف منیٰ میں کیا تھا اس کا ذکر فرمایا، والحمد للہ علی ذلک"۔

مولانا احمد علی صاحبؒ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا تھا

"میرے دل میں جو آپ کی عزت ہے اس کو ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، اسی محبت و عزت کا نتیجہ ہے کہ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کے لیے بارگاہ الٰہی سے استدعا کی اور الحمد للہ اس نے بارگاہ الٰہی میں قبولیت پائی۔"

ایک دوسرے خط میں اپنی محبت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

"چونکہ آپ میرے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو وہ میرے لیے باعث صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہ (حضرت کے بڑے صاحبزادے) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے"۔

ایک خط میں اپنے تعلق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

"عزیز القدر سعادت شعار شرافت مآب ناشر لدین اللہ، لحصول رضا اللہ تعالیٰ، مولوی ابوالحسن علی صاحب زیدت معالکم! آپ کی دینی خدمات سے جتنا مجھے سرور حاصل ہوتا ہے غالباً اتنا دنیا میں کسی اور کو نہیں۔" (۱)

حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اور کام میں مشغولیت کے

(۱) سوانح شیخ الحدیث، ص: ۱۴۱

ساتھ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے تعارف ہوا، اور خود حضرت کے الفاظ ہیں: ''یہ تعلق یوماً فیوماً نہیں آناً فاناً ترقی پذیر رہا اور شیخ اتنی جلدی بے تکلف ہو گئے جیسے میں برسوں سے حاضر ہوتا رہا ہوں۔

مولانا محمد الیاس سے تعلق، دعوت سے مناسبت، بنگلہ والی مسجد میں آمد و رفت کی تفصیل اور حضرت شیخ سے ان کے تعلقات، خصوصی شفقتوں اور ملاقاتوں اور مراسلت کی تفصیل کے لیے سوانح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت، مکاتیب مولانا الیاسؒ ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت شیخ باوجود اپنے بلند روحانی مقام اور مرجع خلائق ہونے کے اہل تعلق کو اپنے وقت کے مستند و مسلم مشائخ بالخصوص شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی طرف اصرار و تاکید سے متوجہ فرماتے رہتے تھے، ایک مکتوب میں حضرت مولانا کو لکھتے ہیں

''رائے پور کے جناب کے سفر کی حقیقی اہمیت بندہ کے نزدیک بہت ہے، اس کو بار بار کیا عرض کروں، بندہ تو بہت ہی ضروری خیال کرتا ہے کہ اہل دل حضرات وہاں جائیں، جب بھی موقع مل سکے چند روز یکسوئی کے ساتھ ضرور تشریف لائیں۔''(۱)

ایک دوسرے مکتوب میں اس کی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انجمن میں آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور للہی آگ انہیں درباروں سے ملتی ہے''۔

اس کے بعد رائپور حاضری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور طرفین میں ایسا تعلق بڑھا کہ لوگوں کے لیے رشک وحسد کا ذریعہ بن گیا۔ ''حضرت رائے پوری نے ایسی شفقت ومحبت کا برتاؤ کیا کہ حضرت اس کو شفقت مادری سے تعبیر فرما دیتے ہیں اور خطوط بھی اسی انداز سے تحریر فرماتے رہے، ایک خط میں حضرت رائے پوری نے محبت آمیز اشعار لکھے، اور حضرت کو شمس تبریز اور اپنے کو مولانا روم کی جگہ قرار دیا ہے۔''

---

(۱) سوانح شیخ الحدیث، ص: ۲۱۵

ایک خط میں اپنے مرید کو تحریر فرمایا: سیدی ومولائی حضرت اقدس دامت برکاتہم۔ حضرت مولانا حضرت کو سیدی ومرشدی بھی لکھا کرتے تھے اس کے جواب میں تحریر فرمایا "حضرت آپ مجھے کیا سیدی ومرشدی لکھتے ہیں، احقر تو حضرت کا خادم ہے، اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے نصیب فرمائے، اکثر اوقات حضرت کا خیال رہتا ہے۔" وغیرہ

مولانا رحمہ اللہ اپنی مجلسوں میں حضرت کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے فرماتے اور جب جب ذکر آتا طبیعت منشرح ہو جاتی، اور اکثر یہ شعر پڑھتے

ذهب الذين يعاش في أكنافهم

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب خدمت میں حاضری ہوتی ہوگی تو کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔

انبساط عید دیدن روئے تو
عید گاہ ما غریباں کوئے تو

حضرت نے ایک جگہ خود تحریر فرمایا ہے:

"ایسے عاشقانہ اور والہانہ تعلق کو مناسبت اور ترقی باطنی میں ہزار افکار اور ریاضتوں سے زیادہ دخل ہے۔"

اس تعلق کی تکمیل اجازت وخلافت سے ہوئی، کاروان زندگی میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت رائے پوری نے اپنے سفر لکھنؤ کے موقع پر جو اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، ۲۴ ر اپریل ۴۸ء کو ہمارے وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کو دوبارہ شرف بخشا، وہیں ایک روز بے سان وگمان حضرت شاہ علم اللہ اور سید صاحبؒ کی مسجد سے باہر نکلتے ہوئے مجھ سے فرمایا، میں آپ کو چاروں سلسلوں بالخصوص حضرت سید صاحبؒ کے سلسلہ میں اجازت دیتا ہوں"۔(۱)

ان دو حضرات کے علاوہ بھی آپ اپنے زمانہ کے مشائخ اور اہل قلوب کی خدمت میں برابر حاضری دیتے اور ان کی بابرکت صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے،

---

(۱) کاروان زندگی، اول: ۳۵۳

ان تمام حضرات نے یہی نہیں کہ عنایت وشفقت فرمائی بلکہ بہت ہی بلند کلمات بھی فرمائے، جومختلف کتابوں میں درج ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے ''مجمع الکمالات'' لکھا اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۲۰/۱۹ سال کی تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دعا دی: ''حضرت سید احمد شہیدؒ کی تجدید ملت اسلامیہ کی خدمت کا علمبردار بنا کر نعمائے لدنیہ سے مالا مال کرے۔''

حضرت مولانا محمد الیاس بانی جماعت تبلیغ نے ''سیدی وسید عالم'' لکھ کر خطاب کیا، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ، حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددیؒ، مولانا محمد احمد صاحبؒ پرتا بگڈھی سے بڑے بلند کلمات سنے گئے۔

غرض کہ آپ اپنے زمانہ کے اہل دل اور اہل علم کے منظور نظر اور محبوب رہے، عالم اسلام میں جہاں بھی گئے وہاں کے اہل قلوب متوجہ ہوگئے، اور آپ کی قدر دانی میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس طرح آپ کو علمائے ربانی اور مشائخ حقانی کی صحبت کا جتنا موقع ملا معاصرین میں کسی کو نہیں ملا، اور یہ بات بھی بلا خوف وتردید کہی جا سکتی ہے کہ جتنا فیض آپ کو مختلف مشائخ سے پہنچا کسی کو نہیں پہنچا، حضرت نے ہر پھول سے اس کا حسن وجمال اور ہر گل سے اس کی لطافت وبانکپن لے کر پوری انسانیت کے لیے ایسا شہد تیار کر دیا جس میں تمام طبقوں کے لیے شفا کا سامان ہے۔

ذکر الٰہی اور مجاہدہ

ذکر کی اہمیت وفضیلت سے قرآنی آیات اور نبوی تعلیمات معمور ہیں، اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے، اس کے بغیر انسان سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا، متقدمین اور متاخرین سب اس پر متفق ہیں، ان حضرات نے ذکر الٰہی کے مختلف طرق اختیار کئے ہیں، تاکہ بآسانی قلیل سے قلیل مدت میں اس کے نتائج واثرات ذاکر پر مرتب ہوسکیں۔

ذکر کی کثرت ہی سے یقین واطمینان، حضوری ودھیان، اخلاص واستحضار، جذب وکیف انوار وبرکات حاصل ہوتے ہیں، بلکہ اس کو زندگی کی روح اور ما حصل قرار دیا گیا ہے

اللہ اللہ ہے تو یارو جان ہے
ورنہ یارو جان بھی بے جان ہے

حضرت رحمہ اللہ سے ایک طالب علم نے ذکر کی تاثیر کے بارے میں سوال کیا، اثبات ونفی کے بارے میں فرمایا کہ اس سے ایمان ویقین مضبوط ہوتا ہے، اور اثبات محض کی تاثیر کے بارے میں فرمایا، اس سے تعلق مع اللہ مضبوط ہوتا ہے۔

حضرت والا نے بھی جب سلوک کی وادی میں قدم رکھا تو اس کو طے کرنے کے لیے ذکر الٰہی کو حرز جاں بنایا اور سلاسل میں جو طریقے ذکر کے مروج ہیں، اس کو اپنا کر منازل سلوک طے کیے اور بامراد اور کامراں رہے۔

ہمارے حضرت کو اخفائے حال کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ عرصہ دراز تک جو حضرات قریب رہے ان کے سامنے بھی اپنے حالات وکیفیات کے اظہار سے ہمیشہ گریز کیا، کاروان زندگی میں نہایت ہلکا سا اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

''سنہ ۱۹۳۰ء کے غالباً اپریل کے مہینہ میں مولانا کی ہدایت وایماء پر میں کچھ دن کے لیے ان کی صحبت وتربیت میں رہنے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر وشغل کرنے کے لیے لاہور حاضر ہوا، مولانا نے ہدایت فرمائی کہ میں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں علیحدہ رہوں، مطالعہ اور علمی اشتغال سے بھی حتی الامکان احتراز کروں۔''

تین مہینہ لاہور میں قیام رہا، مسجد کے قیام میں کیا کیا اعمال واشغال تھے تفصیل سے کبھی کسی سے نہیں بیان کیا، جستہ جستہ ذکر کردیا کرتے تھے، ایک پوچھنے والے سے اتنا بتایا کہ سوائے ذکر وتلاوت کے اور کوئی دوسرا کام نہیں تھا، تنہا اتنی بڑی مسجد میں قیام تھا، نہ کسی سے ملاقات کی اجازت تھی اور نہ علمی کام کرنے کی۔

لطائف پر چھ ہزار اسم ذات کا ذکر فرمایا کرتے، ذکر قلبی کا بڑا اہتمام تھا جس کی وجہ سے ہمہ وقت ذاکر رہتے تھے۔

تہجد سے فارغ ہو کر نفی اثبات جہری کیا کرتے تھے جس کا معمول آخر تک باقی رہا، جوانی میں اوابین کے بعد عشاء تک ذکر میں مشغول رہتے۔

تنہا ایصال ثواب کے لیے گیارہ مرتبہ سے تیرہ مرتبہ تک سورہ یسین کی تلاوت فرماتے اور قرن اول کے اصحاب سے لے کر ہر چھوٹے بڑے تعلق والے کا نام لیتے، اور جن حضرات کا نام لیتے پورے القاب وآداب کے ساتھ لیتے، رواداری میں نام نہ لیتے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمہ اللہ علیہ کا جب نام لیتے، تو فاتح ہندوستان ضرور فرماتے، نام لینے میں گھنٹہ سوا گھنٹہ لگتا اور یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

قرآن مجید تدریس کے زمانہ میں یاد کرنا شروع کر دیا، آپ کے بعض رفقاء کا بیان ہے کہ صبح سے دوپہر تک ٹہل ٹہل کر یاد کرنے کا معمول بھی رہا ہے، اس کے علاوہ تلاوت کے الگ معمولات تھے، اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر زبانی بھی سناتے تھے اور دیکھ کر بھی تلاوت فرماتے۔

آخر میں اپنے والد صاحب کی کتاب تہذیب الاخلاق جو حدیث کا انتخاب ہے کا مطالعہ فرماتے اور بہت مسرور ہوتے۔

صحیح بخاری کے ڈیڑھ دو صفحے سننے کا بھی معمول ہو گیا تھا، جو بیماری کے دن تک جاری رہا، تکیہ کے قیام میں عزیز القدر مولوی بلال عبدالحی حسنی ندوی سلمہ اللہ ونفع بہ کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی، اور دارالعلوم کے قیام میں راقم کو یہ سعادت حاصل ہوتی، سنتے وقت اہتمام سے بیٹھ جاتے، خود بھی بسم اللہ پڑھتے اور نہایت خشوع سے یہ دعا کرتے، اللھم انفعنا بالآیات والذکر الحکیم، اور توجہ فرماتے پھر میں تلاوت شروع کر دیتا۔

جہاں تک مجاہدہ وریاضت کا تعلق ہے پوری زندگی اس کا عکس جمیل ہے، ندوہ کے قیام میں بکثرت ایسا ہوتا کہ ناشتہ کی نوبت ہی نہ آتی، بغیر اس کے تدریس میں مشغول ہو جاتے، سخت بیماریوں میں پر مشقت اسفار کی کثرت، دوسروں کی دلداری کی خاطر جان ومال کی پرواہ نہ کرنا، اس کو قلم بند کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔

خودرائی سے پرہیز

ایک عارف نے کوچہ عشق میں قدم رکھنے کی شرط بیان کی ہے اور اس کو ضروری قرار دیا ہے ؂

جب تک فنائے رائے کی ہمت نہ پایئے
کیوں آپ اہل عشق کی محفل میں آیئے

یہ اس راہ کا دستور ہے، سب ہی اس پر چل کر کامیاب ہوئے ہیں، حضرت مولانا نے بھی اس کو نبھایا، بلکہ پوری زندگی اس پر عمل کر کے دکھایا، حضرت اپنی تمام علمی اور فکری بلندیوں کے باوجود ہمیشہ اپنے بڑوں کی بات مان کر چلے، اپنے بڑے بھائی کی ہمیشہ بات مانی، فرماتے تھے بات ماننے میں ہمیشہ فائدہ ہوا ہے، ایک دو دفعہ نہیں مانی اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔

حضرت رائے پوری کے تعلق سے فرمایا: ایک مرتبہ ایک اہم سفر درپیش تھا، حضرت رائے پوری کی رائے یہ تھی کہ اس وقت سفر نہ کروں میں نے فوراً بات مان لی، حضرت نے امتحاناً میرے چہرے کو دیکھا کہ ناگواری تو نہیں ہوئی حضرت فرماتے تھے کہ الحمد للہ مجھ پر بالکل اثر نہیں پڑا، حضرت رائے پوریؒ اس سے بہت خوش ہوئے، اس کے بعد عنایات و شفقتیں بہت فرمائیں۔

حضرت فرماتے: یہ حضرات یہ بات بہت دیکھتے ہیں کہ خوش دلی کے ساتھ کون مانتا ہے، حضرت رائے پوری کے وصال کے بعد حضرت شیخ الحدیث سے اہم چیزوں میں مشورہ کرنے لگے تھے یہ بھی معمول ہمیشہ قائم رہا، اور خوردوں میں بھی جو بات مانتا، اس سے بہت خوش ہوتے اس کو دعائیں دیتے، اس کو اس کے لیے ترقی کا زینہ قرار دیتے۔

تربیت و تعلیم

حضرت مولاناؒ طالبین وسالکین کی تربیت میں ان کی طبیعت، ذوق، مشغلہ

ضرورت، صحبت وتحمل اور استعداد وترقی کی صلاحیت کا لحاظ رکھتے تھے وہ ہر ایک کے حال کے مطابق اس کو ذکر کی تلقین کرتے تھے اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے کہ اس توہمات وخرافات اور عجمی اثرات کے دور میں عقیدۂ توحید پر ضرب نہ پڑنے پائے، اور مقاصد ووسائل کا تمیز بھی مجروح نہ ہو۔

ایک مسترشد نے عرض کیا میں دفتر میں کام کرتا ہوں میز پر آپ کی تصویر رکھنا چاہتا ہوں، حضرت نے سختی سے روک دیا۔ ایک پرانے طالب علم نے تصور شیخ کی اجازت چاہی، فرمایا حضرات نقشبند کے یہاں ہے، لیکن ہمارے سلسلہ میں حضرت سید صاحبؒ کے بعد سے متروک ہے۔

سہولت کا بھی خاص خیال فرماتے، ابتدائی طور سے صرف تین تسبیحات کی پابندی بتاتے، بعض طالبین نے مزید چاہا اجازت نہیں دی، بعض کو سورۂ اخلاص کی ایک دو تسبیح بتادیں، بعض کو معاملات کی صفائی، فرائض کی پابندی، جن دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان میں نیت کا استحضار رکھنے کی تلقین فرماتے، اکثر طالبین کو قلبی ذکر پانچ سو مرتبہ بتادیتے ورنہ حسب استعداد وصلاحیت ذکر جہری بھی بتاتے، بعض کو بیعت کے بعد ہی چوبیس گھنٹے کے معمولات بتادیئے، معمولات کی پابندی ضروری سمجھتے، ایک طالب کو لکھتے ہیں کہ معمولات کی پابندی رکھئے اس سے کام میں برکت ونورانیت آتی ہے، اکثر وبیشتر بیعت کے الفاظ دہرانے کے بعد ہی حالات میں تغیر شروع ہوجاتا تھا، ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ سلسلہ میں منسلک ہونے کے بعد ہی دل کی حالت بدل گئی، ایک صاحب جو بیعت وغیرہ کے قائل نہیں تھے، وہ بیعت ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ان الفاظ کا ان پر یہ اثر ہوا کہ گریہ طاری ہوگیا اور پھر استخارہ وغیرہ کرنے کے بعد بیعت ہوگئے، مشائخ میں تنہا حضرت کی ذات تھی جن سے وہ حضرات بھی بیعت ہوئے جو بظاہر اس کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ایسی جماعتوں سے ربط رکھنے والے ہوتے تھے جو تصوف کے نام سے گھبراتے ہیں، ایسے ہی ایک

موقع پر مزاحاً حضرت نے فرمایا: میری خانقاہ ماڈرن خانقاہ ہے۔

حضرت بیعت میں جن باتوں کا عہد لیتے وہ نیچے درج کی جارہی ہیں، بیعت کے بعد عام لوگوں سے خاص طور سے فرماتے، نہ ولی سے نہ قطب سے نہ ابدال سے کسی سے کچھ نہیں ہوسکتا، سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ الفاظ بھی بیعت کے الفاظ کے ساتھ درج کیے جارہے ہیں۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اللہ کے سوا کوئی مالک ومعبود نہیں ہے اور محمد رسول ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ یا اللہ! ہم توبہ کرتے ہیں کفر سے، شرک سے، بدعت سے، زنا سے، چوری سے، پرایا مال ناحق کھانے سے، کسی پر بہتان لگانے سے، نماز چھوڑنے سے، جھوٹ بولنے سے، اور سب گناہوں سے جو ہم نے اپنی ساری عمر میں کیے، چھوٹے ہوں یا بڑے اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سب حکموں کو مانیں گے، تیرے رسول پاک ﷺ کی تابعداری کریں گے، اے اللہ! تو یہ ہماری توبہ قبول فرما، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہمیں توفیق دے نیک عملوں کی، اپنے رسول پاک ﷺ کی تابعداری کی۔"

اس کے بعد ہاتھ چھوڑ دیتے اور فرماتے: یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس دنیا کا خالق ہے اور وہی حاکم و منتظم ہے، اس نے دنیا کو بنایا، اور وہی اس کو چلا رہا ہے، اس کے حکم کے بغیر نہ پتہ ہل سکتا ہے اور نہ ذرہ اڑ سکتا ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی شفا دیتا ہے، وہی عزت دیتا ہے، وہی ذلت دیتا ہے، وغیرہ۔ کبھی اس کے ساتھ اور باتیں بھی فرمادیتے۔

بیعت ہونے کے بعد مراسلت کے ذریعہ یا خدمت میں حاضر ہوکر اور خاص طور سے رمضان المبارک میں خدمت میں طالبین رہ کر اپنے حالات بتاتے اور رہنمائی لیتے، حضرت نے اس سلسلہ میں جن کو مناسب سمجھا اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

ارادت وبیعت کا تعلق رکھنے والوں کے لیے جو شجرے سلاسل کے طبع کرائے گئے تھے ان کے لیے حضرت رحمہ اللہ نے ہدایات ومشورے دیئے، جن کو اس کے

ساتھ طبع کر دیا گیا تھا، یہاں ان ہدایات کو نقل کیا جا رہا ہے، تاکہ تمام قارئین اور خاص طور سے حضرت کے متعلقین و متوسلین کو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔

''بیعت کرنا اور سلسلہ میں داخل ہونا کوئی رسمی اور شوقیہ چیز نہیں ہے جس کے لیے کچھ ماننا اور کرنا نہ پڑے، محض برکت یا شہرت مقصود نہ ہو، ایک عہد و معاہدہ اور ایک نئی دینی و ایمانی زندگی کا آغاز ہے جس میں زندگی میں کچھ تبدیلیاں، کچھ پابندیاں اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔

۱-سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ بیعت اور سلسلہ میں داخل ہونا کلمہ کی تجدید اور اسلامی عہد و معاہدہ اور اللہ و رسول کے احکام کے مطابق دینی و ایمانی زندگی گزارنے کا قصد و ارادہ اور عہد و معاہدہ سمجھا جائے۔

۲-سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عقیدہ درست اور پختہ کیا جائے، اور اس بات کا اقرار اور اس پر ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں جلانے اور مارنے، صحت و شفا دینے، اولاد دینے، روزی دینے اور قسمت اچھی بری کرنے کا اختیار نہیں ہے، اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں ہے، نہ اس کے سوا کسی کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے، نہ بندگی کی کوئی شکل اختیار کی جا سکتی ہے، نہ حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سوال کیا جا سکتا ہے۔

۳-سید المرسلین و خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی، ذریعۂ ہدایت، وسیلۂ شفاعت اور سب سے زیادہ محبت اور اتباع و پیروی کا مستحق سمجھا جائے اور زیادہ سے زیادہ آپ کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور دینی و دنیوی زندگیوں میں آپ کی ہدایات آپ کے معمول اور دستور پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے، آپ کی سیرت پاک کے مطالعہ کا اہتمام کیا جائے اور آپ کی احادیث کے مجموعوں اور سیرت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔

۴-زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے اور صحیح مقاصد زندگی معلوم کرنے کے لیے (حضرت مولانا علی میاں ندویؒ) کی کتاب دستور حیات کو مطالعہ میں رکھا جائے، نیز حکیم

الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔

۵- سب سے اہم فریضہ اور ضروری چیز نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنا اور اہتمام اور سنتوں کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا ہے، اس میں غفلت اور تساہلی کی تلافی کوئی چیز نہیں کر سکتی، نمازیں جماعت کے ساتھ حتی الامکان مسجد میں ادا کی جائیں، مستورات ان نمازوں کو اپنے وقت پر پڑھنے کی کوشش کریں، جو عام طور پر کاموں کی مصروفیت اور ذمہ داریوں کی وجہ سے فوت ہو جاتی ہیں یا ان کا وقت نکل جاتا ہے۔

۶- دینی و دنیوی دونوں کاموں میں ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت کی مشق کی جائے، اخلاق ومعاملات اور زندگی کے معمولات میں بھی اس کا اہتمام کیا جائے تاکہ ان پر عبادت کا ثواب ملے اور ان کو حتی الامکان شریعت اور سنت کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے، اخلاقی ومزاجی کمزوریوں، حسد وکینہ، حد سے بڑھے ہوئے غصے بدگمانی اور بدزبانی اور مال ودولت اور دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔

۷- قرآن مجید کی جس قدر سہولت کے ساتھ ممکن ہو تلاوت کا معمول بنایا جائے۔

۸- فجر کی نماز سے پہلے یا بعد مغرب یا عشاء کے بعد جس وقت آسانی سے ممکن ہو اور پابندی ہو سکے ایک تسبیح درود شریف کی ایک کلمہ سوم کی اور ایک استغفار کی پڑھ لی جائے، اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اخیر شب میں کچھ رکعتیں تہجد کی بھی پڑھنے کی کوشش کی جائے اور اپنے سلسلہ کے مشائخ اور تعلق والوں کے لیے دعا کی جائے۔"

باطنی کیفیات اور چند نمایاں صفات عشق ومحبت

حضرت نے ایک جگہ خود تحریر فرمایا ہے: کامل الاحوال بزرگوں کی باطنی کیفیات کا اندازہ عامی کیا لگا سکتے ہیں ان حضرات کا احوال ومسلک یہ ہے کہ ؎

عشق عصیان است گر مستور نیست

لیکن پھر بھی پیمانہ جب لبریز ہوتا ہے تو دو چار قطرے ٹپک پڑتے ہیں، ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں، ضبط گریہ اور اخفائے حال کی کوشش اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں جس

سے سینہ معمور اور دل مخمور ہے کسی حقیقت شناس نے عرصہ ہوا کہا تھا۔

خوشتر آں باشد کہ سر دل براں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اصحاب احوال جب کسی شعر کا انتخاب کرتے ہیں تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ان کی حقیقت حال کی تصویر اور ان کے دل کی سچی ترجمانی اور تعبیر ہے۔

حضرت کو علامہ اقبال کے اشعار سے ایسا ہی تعلق تھا جن اشعار کا انتخاب کیا ہے اس سے حضرت کو سمجھا جاسکتا ہے، نقوش اقبال کا مطالعہ اس کے لیے مفید ہوگا، علامہ کے علاوہ بھی حضرت کا انتخاب بہت لاجواب ہے، خواجہ میر درد کا یہ شعر حضرت پڑھتے تھے بڑے ذوق وشوق سے۔

جایئے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

یہ اشعار بھی بڑے ذوق سے پڑھتے اور پوری پوری غزل سنادیتے۔

نکل کے راہ عشق سے چلوں تو کس طرف چلوں
کہاں سے لاؤں جان ودل یہ دے چکا وہ کھوچکا

علامہ کے یہ اشعار بھی بڑے والہانہ انداز سے پڑھا کرتے تھے۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

توحید وسنت سے ایسا عشق تھا کہ جس کا صحیح اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو حضرت کے زیادہ قریب اور سفر وحضر میں ہم رکاب رہا کرتے تھے، کتنے درد وسوز سے آپ مولائی انی الی فضلک لفقیر، وقتاً فوقتاً فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کے پورے استحضار کے ساتھ کئی کئی مرتبہ خدایا عاقبت محمود گرداں فرماتے، تقریروں میں عقیدۂ توحید پر بہت زور دیتے، حضرت یوسف علیہ السلام کا وعظ، حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت اور شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شرف الدین منیری نے توحید کے

سلسلہ میں جو واقعات درج کئے ہیں ان کو خاص انداز سے بیان کرتے۔

اخیر میں اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ ہر بیعت کرنے والے ایک ہوں یا زیادہ ہوں الفاظ بیعت کے بعد عقیدۂ توحید اختیار کرنے اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کی وصیت فرماتے، شرک و بدعت، بے جا رسم و رواج اور قبر پرستی سے بچنے کی تلقین فرماتے۔

آستانوں اور درگاہوں پر جو کچھ ہو رہا ہے نہایت درجہ تاسف کا اظہار فرماتے، اور ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ان سجادوں کو الٹ دو، اس کو کھلا ہوا شرک قرار دیتے۔

اس کے ساتھ سنت کا اہتمام یہاں تک کہ عادی اور طبعی امور میں مکمل اس کا خیال رہتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا والہانہ تعلق تھا جو ہر شخص محسوس کر لیتا جب مؤذن اذان دیتا تو فوراً ٹوپی لگا کر بیٹھ جاتے نہایت ادب و احترام سے الفاظ اذان دہراتے، جب مؤذن محمد رسول اللہ کا کلمہ کہتا تو آپ لفظ محمد کو اتنی محبت اور پیار سے ادا فرماتے کہ سننے والوں کو بھی لطف آتا اور نہایت ہی والہانہ انداز اور محبت بھرے لہجہ میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے، آج بھی آپ کے شیریں الفاظ کانوں میں رس گھول رہے ہیں، اللہ تعالیٰ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب فرمائے، اور مراتب عالیہ سے سرفراز کرے۔ آمین

تیسری کیفیت جو آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ اسلام کی فکرمندی اور دل سوزی ہے، یہ صفت ایسی غالب تھی کہ آپ مفکر اسلام کہلائے، بہت سے لوگ صرف الفاظ سے اظہار کرتے ہیں تو ان کو اس لقب سے سرفرازی حاصل ہو جاتی ہے، حضرت والا کی فکرمندی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، بلکہ روح میں سرایت کر گئی تھی، جس کی وجہ سے آپ بے خوابی میں بھی مبتلا ہو جاتے اور آخر میں کھانے کی اشتہاء بالکل ختم ہو گئی تھی، حضرت والا نے اپنے مرشد مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے لیکن وہ خود حضرت کا حال تھا، جو حدیث دیگراں میں آگیا ہے یا یوں کہیے کہ شیخ کی نسبت حضرت میں منتقل ہو گئی تھی، اور جوش مار رہی تھی۔

اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کے حالات سے دردمندی طبیعت ثانیہ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی، اس کے لیے نہ زندگی کا کوئی شعبہ مخصوص

تھا، نہ عمر کا کوئی وقت یہ درد جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہوگیا تھا ۔

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

جس گروہ سے آپ کا تعلق تھا اس کا ذکر و شغل اس کا انقطاع الی اللہ اس کی یکسوئی و بے نیازی اس کو مسلمانوں سے جدا نہیں اور بے فکر نہیں بناتی بلکہ اور زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے درد میں مضطرب اور بے قرار بناتی ہے، اور اس گروہ کا ہر فرد زبان حال سے کہتا ہے

مرا دردیست اندر دل چومی گویم زباں سوزد
گرد دل درکشاں ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد کبھی زباں پر آ کر آہ وفغاں میں تبدیل ہوجاتا، کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں اور ناسمجھیوں پر درد وقلق کے اظہار اور ملامت وتنبیہ پر آمادہ کرتا، کبھی تنہائی میں آنسوؤں میں تبدیل و تحلیل ہوجاتا لیکن وہ دم کے ساتھ تھا اور اس سے کسی وقت قرار نہ تھا۔

چوتھی صفت فنائیت و بے نفسی

حضرت نے اپنے مربی و مرشد حضرت مولانا عبد القادر صاحبؒ کی فنائیت و بے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ وتاثر جو کچھ بیان فرمایا وہ ہم سب حاضرین اور سفر وحضر میں ساتھ رہنے والوں کا بعینہ حضرت کی ذات کے متعلق ہے کہ کبھی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بوآتی ہو، حب جاہ کا یہاں سر کٹا ہوا تھا۔

حضرت نے اپنے مرشد حضرت رائے پوریؒ کا یہ واقعہ کئی مرتبہ سنایا کہ ایک مرتبہ کچھ بڑے حضرات خدمت میں حاضر ہوئے مجلس لگی ہوئی تھی حضرت خاموش تھے خدام کو فکر ہوئی کہ حضرت کچھ کلام فرمائیں تاکہ نئے حاضرین پر اچھا اثر پڑے تو کسی نے پوچھا حضرت صبر کا کیا مطلب ہے؟ حضرت خاموش رہے پوچھنے والے نے سمجھا کہ حضرت نے سنا نہیں ذرا بلند آواز سے دوبارہ پوچھا حضرت نے مولانا کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ علی میاں سے پوچھ لو، مولانا نے عرض کیا میں تو صرف اس کے ظاہری معنی بتا سکتا ہوں اس پر حضرت نے فرمایا کہ میں تو وہ بھی نہیں بتا سکتا، اس کے بعد پھر برابر خاموشی رہی۔

یہی حال ہمارے حضرت کا پوری زندگی رہا کوئی آئے نہ آئے معتقد ہو یا نہ ہو کبھی کسی اشارے و کنایہ میں بھی نہیں کہا کہ مجھ سے بیعت ہو جائے، شروع میں تو اکثر دوسرے مشائخ کی خدمت ہی میں بھیجنے کا معمول تھا جو حضرات اصرار کرتے ان کو بیعت فرما لیتے۔

حضرت نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے کام کئے کیسے کیسے کارنامے آپ کی ذات سے وابستہ ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں سنا کہ "یہ میں نے کیا ہے" "یہ ہمارا کارنامہ ہے" "میں" اور "ہم" گویا آپ کی لغت میں تھے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ کے بحر جود وسخا میں ہم اور میں ایسے گم ہو چکے تھے کہ جب زبان تحدیث نعمت کے لیے کھلی تو یہی سنا گیا کہ "اللہ کی توفیق سے یہ کام ہو گیا" "یہ ہمارے والد صاحب رحمہ اللہ کا اخلاص" "بھائی صاحبؒ کی تربیت کا نتیجہ" "ماں کی دعاؤں کا ثمرہ" اور "بزرگان دین کی صحبت" اور "شیخ کی توجہ کا اثر ہے" "ورنہ میں ایک دیہات کا رہنے والا نہ زیادہ ذہین نہ حافظہ" ۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں، خاص طور سے اپنے بھائی مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ جو اصلاً آپ کے مربی رہے، جب بھی ذکر کرتے تو آنکھیں ضرور اشک کا نذرانہ پیش کرتیں۔

چاروں طرف سے مبشرات کے خطوط آتے، زبانی بھی لوگ آکر بیان کرتے اور خود آپ بھی خواب میں دیکھتے، کبھی اپنے متعلق کبھی کسی تصنیف کے تعلق سے کبھی ان کا دوسروں کے سامنے ذکر کرتے اور نہ کبھی کسی تصنیف میں درج کرتے، صرف ایک بات فرماتے میں تو اس لائق نہیں ہوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلق سے کوئی آپ کو خوش خبری دیتا تو دو ایک آنسو ٹپک جاتے اور ایک آدھ اپنی نااہلی کا لفظ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔

یہ صفت شروع سے اخیر تک قائم رہی اس کو آپ سلوک کے لیے بہت ضروری

سمجھتے تھے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''اپنی نااہلی کا احساس اور اپنے کو سب سے ادنی اور کسی قابل نہ سمجھنا اس راہ کی سب سے اونچی بات ہے، اور اس میں سالک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا راز ہے۔''

اپنے متعلق حضرت رائے پوریؒ کو ایک خط میں حاضری کے تاثرات لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''جب اپنی بدعملی اور قطعی نااہلی پر نظر جاتی تھی اور خیال ہوتا تھا کہ ہم جیسے ایسی پاکیزہ مجلس کے حواشی میں بیٹھنے کے لائق نہیں تو حضرت کی عنایات خصوصی پر بہت ہی ندامت اور شکر کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور دل سے دعا نکلتی کہ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کو ہم نااہلوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں۔''

اس فن میں حضرت کا کیا مقام تھا یہ اہل مقام جانیں چند باتیں اس کے تعلق سے عرض کردی گئی ہیں کیفیات کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کردی گئی ہے

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

کوئی ہشت پہل ہیرہ کہتا ہے، کوئی مجموعۂ حسنات، کوئی پھولوں کا گلدستہ قرار دیتا ہے، کوئی قوس وقزح، کوئی علم کا آفتاب کہتا ہے، کوئی عشق کا ماہتاب، کوئی

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

کوئی حکیم ودانائے راز کہہ کر پکارتا ہے، جس کے ہزار پہلوؤں پیچ دانوں کے لیے کسی ایک کا بھی حق ادا کرنا مشکل ہے، بازار میں اپنی پونجی لے کر یہ غریب بھی نام لکھانے آتا ہے، شاید اس کے حصہ میں بھی کچھ آجائے، اور دامان رحمت میں جگہ پانے کا مستحق ہوجائے۔ واللہ ولی التوفیق۔

افادات حسنہ

ذیل میں حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے ملفوظات کا وہ انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی ذات وصفات اور مختلف سماجی وعلمی میدانوں میں آپ کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز ان باتوں کی طرف بھی اشارہ ہے جن سے اکابر قوم وملت کے نزدیک آپ کا مقام ومرتبہ نمایاں ہوتا ہے۔

والدہ ماجدہ کا حال

ہمارے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی والدہ ماجدہ ماشاءاللہ بہت بزرگ صفت خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو خوب نوازا تھا، پورے گھر کے لوگ ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے، بلکہ بیٹھتے ہی نہیں تھے، ان سے ایک روحانی سکون بھی حاصل کرتے تھے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام عطا فرمایا تھا، جو کم ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، ان کا معمول یہ تھا کہ رات کو ڈھائی بجے اٹھ جاتیں، اشراق تک اپنے مصلیٰ پر بیٹھی رہتی تھیں، اور یہ معمول ان کا آخری دور تک رہا، ان کو دعا سے بہت مناسبت تھی جو مانگتی تھی وہ فوراً قبول ہو جاتا تھا، اس کو انہوں نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

جو مانگا ہے جو مانگیں گے خدا سے ہم وہی لیں گے
مچل جائیں گے روئیں گے کہیں گے ہم یہی لیں گے

پوری پوری رات وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے روتی تھیں، گڑگڑاتی تھیں، یہاں تک کہ خواب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی نصیب ہوئی، اور ان سے براہ راست

بیعت ہوئیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسی بابرکت خاتون کے پاس بیٹھنا، ان کی خدمت میں حاضر ہونا کتنی بڑی سعادت ہے، ان کی خدمت میں بیٹھنے سے ایک خاص اثر پڑتا تھا، اور یہی تاثیر ہم کو سب سے بڑھ کر حضرت مولاناؒ کی حیات میں نظر آتی ہے، کیونکہ آپ انہی کی صحبت میں رہ کر پروان چڑھے تھے۔

والدہ ماجدہ کی تعلیم

حضرت مولاناؒ کی والدہ نے ایک مرتبہ مولانا کو خط لکھا کہ: علی اپنے عقید کی فکر کرو، اس وقت اچھے اچھے علماء کا عقیدہ صحیح نہیں ہے۔'' اس سے یہ معلوم ہوا کہ جب حضرت مولانا کی والدہ ماجدہ نے آج سے کئی سال پہلے عقیدۂ توحید کی طرف ان کو متنبہ کیا تھا، تو آج کے زمانہ میں ارباب حل وعقد کو بدرجہ اولیٰ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو چیک کرتے رہیں کہ ہمارا عقیدہ قرآن وحدیث کے مطابق ہے یا نہیں؟ اسی لیے یہ یاد رہے کہ اگر ہم نے جائزہ نہیں لیا، تو خسران (گھاٹا) بڑھتا ہی جائے گا، اور اگر جائزہ لے کر صحیح کام میں لگے رہے، تو اللہ کم علم میں بھی بہت برکت عطا فرمائے گا، حضرت مولاناؒ کو ان کی والدہ نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''علی تم ہماری اکیلی اولاد ہو، لیکن تم سے سو کی امیدیں وابستہ ہیں''، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ سو نہیں بلکہ ہزاروں، لاکھوں سے زیادہ کی امیدیں برلائے، جس کی وجہ یہی تھی کہ ان کا عقیدۂ توحید بالکل ٹھیک تھا۔

تشکیلی عناصر

حضرت مولاناؒ نے اپنے بارے میں فرمایا: میرے شیخ کی توجہات، والد صاحب کا اخلاص، بھائی صاحب کی تربیت، والدہ ماجدہ کی دعاؤں نے مجھے کسی لائق بنایا ہے۔

حرام مال سے حفاظت

قساوت قلب سے حفاظت کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان ہمہ

وقت یہ خیال رکھے کہ اس کے پیٹ میں جانے والی یا اس سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز ایسی تو نہیں ہے جو اندر جا کر سیاہی پیدا کردے، اور دل کو مردہ کردے، ہمارے حضرت مولاناؒ بچپن میں ایک کھلائی کے ساتھ کسی جگہ چلے گئے، جہاں ہندوؤں کا چالیسواں یا تیجہ تھا، وہاں وہ غریب عورت بیٹھ کر کھانا کھانے لگی، مولانا تو بچے تھے انہوں نے کھانا چاہا تو اس کھلائی نے کہا: میاں! تم نہ کھاؤ، اس سے تمہارا دل سیاہ ہوجائے گا، ہم کھاسکتے ہیں، کیونکہ ہم غریب آدمی ہیں، تمہارے گھر میں یہ نہیں کھایا جاتا ہے، اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ بچپن سے جس کی حفاظت کی گئی ہو کہ ان کو کھانے کا وہ لقمہ منھ میں نہیں جانے دیا جو بچہ ہونے کی عمر میں معفو عنہ ہے، تو بڑے ہوکر ایسے شخص کے حرام مال سے اجتناب کرنے کا کیا عالم رہا ہوگا؟

سلسلہ نسب محفوظ رہے

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: ہر چیز کا سلسلہ نسب ہے اگر وہ نسب اپنی اصل تک نہ پہنچے تو وہ نسب قابل اعتبار نہیں، لہٰذا مسجدوں کا سلسلہ نسب مسجد حرام ہے، اور مسجد نبوی ہے اور مسجد اقصیٰ ہے، اگر اس کا سلسلہ وہاں جا کر ختم نہ ہو تو اس کا نسب معتبر نہیں، ایسے ہی مدارس کا سلسلۂ نسب صفہ نبوی پر ختم ہوتا ہے۔ مسجد نبوی کا صفہ وہ ہے جس پر صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد رہا کرتی تھی جو کہ ہر ایک سے بے نیاز ہوکر دربار رسالت کے نیاز مند ہوگئے تھے، اور انہوں نے ہر چیز سے منھ موڑ کر صرف علم اور دربار رسالت کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ تو مدرسہ کا سلسلہ نسب صفہ پر منتہی ہوتا ہے، اور مسجد کا مسجد حرام پر۔

شیطان کی عقل مندی

حضرت مولاناؒ نے ایک موقع سے فرمایا: شیطان بڑا عقل مند ہے، ایسا نہیں ہے کہ شیطان کسی نیک بندے سے آکر یہ کہے کہ تم چوری کرو، تم زنا کرو، کیونکہ اگر شیطان کسی نیک

آدمی سے ایسا کہہ دے گا تو مار کھا جائے گا، بلکہ وہ اس طرح سے پٹی پڑھاتا ہے کہ حضرت آپ سے بڑا کوئی نہیں ہے، آپ کے پاس سب کو آنا چاہیے، آپ کسی سے نہ ملئے گا، آپ کہیں نہ جایئے، کیونکہ آپ بڑے آدمی ہیں، آپ کیوں کسی کے یہاں جائیں گے ؟ ساری دنیا کو آپ کے پاس آنا چاہیے، معلوم یہ ہوا کہ شیطان کے مکر وفریب سے محفوظ کوئی نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کو اپنے معیار کے اعتبار سے اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

بد نیتی یا بے نیتی

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: آج کے دور میں میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ بدنیت ہیں، بلکہ خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں وہ بے نیت نہ ہوں، کیونکہ ہم کو عموماً اچھے کاموں میں بھی نیت کا استحضار نہیں رہتا، اس لیے ہم جب بھی کوئی عمل کریں تو اس بات کا خیال میں رکھنا نہایت ضروری ہے، کہ ہم پہلے اپنا جائزہ لے لیں، کہ کس نیت سے ہم یہ کام کر رہے ہیں؟

نیک نیتی کا بدلہ

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: ایک مرتبہ ان کی ملاقات حسن البناء شہید کے والد عبد الرحمٰن بن البناء سے ہوئی، جو کہ بہت بڑے عالم محقق ہیں، ان سے جب حضرت مولاناؒ نے پوچھا کہ اپنے لڑکے کے بارے کچھ میں بتایئے، تو انہوں نے کہا کہ پہلے میری کوئی اولاد نہیں تھی، ایک دن میں مسجد میں گیا تو ایک چھوٹے سے لڑکے کو میں نے دیکھا کہ وہ بہت ہی خشوع وخضوع سے نماز پڑھ رہا ہے، تو اس کی نماز سے میں تڑپ گیا، اور میرے اوپر ایک کیفیت طاری ہوگئی، تو میں نے نماز پڑھی اور دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اولاد دے اور ایسا ہی صالح لڑکا عطا فرما، جو اس طرح نماز پڑھنے والا ہو، تو اس کے بعد میرا لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام میں نے **حسن** رکھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حسن کا پیکر بنا دیا، اور اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا کام لیا کہ پورے عالم اسلام میں آج تک

ادھر ایک ڈیڑھ صدی میں کوئی ان کا جیسا نظر نہیں آرہا ہے، ان کے ذریعہ سے خوب دین پھیلا، یہاں تک کہ ہر وہ شخص جو عالم ہے، وہ ان کا بھائی ہے، اور وہ ان کو صحیح طور پر جانتا ہے تو وہ دین دار ہے، تو بات یہ ہے کہ ہم جو نیت کریں اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، اور یہ اسی وقت ہوگا جب ہماری نیتوں کے کرنے کے ذرائع یعنی فکر و دماغ اور جسم، یہ سب حلال طریقہ پر پروان چڑھے، اگر حلال طریقہ سے پروان چڑھے گا تو دعا بھی اچھی ہوگی، نیت بھی اچھی ہوگی۔

محنت کا محل صحیح نہیں

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: آج مسلمان جہاں بھی غیر جگہوں میں محنت کر رہے ہیں، وہ سب جہاد فی غیر جہاد کے زمرے میں ہے، اگر مسلمان ان جگہوں سے ہٹ کر صحیح طور پر محنت کریں، تو حالات ٹھیک ہو جائیں گے، اس کے علاوہ اصلاح کے تقاضوں میں سے اولاً عقیدہ کی اصلاح ہے، پھر اخلاقیات، معاملات، معاشرت وغیرہ ہیں جن کے اصلاح کی ضرورت ہے، لیکن اس اصلاحی کام کے لیے علماء اگر آگے آئیں تو ان کو بھی اجرت نہیں لینی چاہیے، اور قوت برداشت اور صحیح معنی میں تواضع ہونی چاہیے۔

محنت کے لیے جگہ شرط نہیں

مولانا علی میاںؒ، کوئی مکہ مکرمہ یا بیت اللہ کے اندر سے نہیں نکلے تھے کہ آئے اور فوراً کام کرنا شروع کر دیا ہو، بلکہ مولانا بھی یہیں ندوہ کے پڑھے ہوئے تھے، لندن، امریکہ میں بھی نہیں پڑھا تھا، ہاں بعد میں یہاں سے پڑھنے کے بعد گئے، لیکن لندن و امریکہ والوں کو پڑھایا، کیونکہ جب آدمی علم کے اس مقام بلند پر پہنچ جاتا ہے تو پوری دنیا اس کے بس میں ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سارے بڑے بڑے سربراہانِ مملکت، اور اپنے اپنے زمانے کے وزرائے مملکت ان کے پاس آتے رہتے تھے، وہ تو کسی کے پاس جاتے بھی نہیں تھے،

لیکن پھر بھی ہندوستان کا کوئی ایسا وزیر اعظم نہیں ہے جو مولانا کے پاس نہ آیا ہو۔

صحیح محنت کے فوائد

ہمارے حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ رسال محنت کی، اور صحابہ نے ساتھ دیا، اور ۲۳ رسال کی محنت سے ایک ہزار سال تک مسلمانوں کا خوب عروج رہا، اور کسی بھی محنت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، ایسے ہی اگر ہم بھی صحیح اصول کے ساتھ محنت کر لیں، تو پھر ہم بیٹھ بھی جائیں، تب بھی ہماری محنت اسی طرح نفع بخش ثابت ہو گی، لیکن تھوڑی محنت کرنی پڑے گی، بغیر محنت کے کچھ نہیں ہو گا، اور اس وقت محنت ہی کی ضرورت ہے، ورنہ اس وقت مسموعات کی تو گرم بازاری ہی ہے۔

مقصود فلاح آخرت رہے

ایک مرتبہ افغانستان میں روس سے جہاد ہو رہا تھا، تو حضرت مولانا نے دار العلوم میں اساتذہ کو بلا یا کر فرمایا: اس وقت سب سے اہم کام تو یہی تھا کہ اللہ ہم کو وہیں قبول فرما لیتا، اور ہر شخص جہاد میں جاتا، کیونکہ یہ سب سے بڑا عمل، سب سے اچھا عمل ہے، اور اللہ کے یہاں بھی مقبول ہے، جنت کا شارٹ کٹ راستہ ہے، لیکن وہاں ہم نہیں جا سکتے ہیں، تو یہاں پر رہ کر اس کے مقام کو پانے کے لیے ہم کو جو کرنا ہے وہ کرنا چاہیے، یعنی اخلاص سے کام کرنا چاہیے، اللہ کے لیے کام کرنا چاہیے، اس لیے کہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے، اور یہاں کی کامیابی کوئی چیز ہی نہیں ہے، یہاں کی شہرت بھی مل گئی، تو کیا حاصل؟ کچھ تھوڑی دیر کے لیے، آپ اوپر بیٹھ بھی گئے تو کیا حاصل؟ اور تھوڑی دیر لوگوں نے آپ کا نام لے بھی لیا تو کیا حاصل؟ وہ کتنی دیر تک باقی رہے گا؟ لیکن اللہ کی طرف سے جو بات آتی ہے، وہ پائیدار رہتی ہے۔

اللہ رزاق ہے

آج کل دیندار طبقہ کا بھی یہ حال ہے کہ بظاہر ان کا ایمان ﴿ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾ پر نہیں معلوم ہوتا، ہر جگہ ان کو یہی خیال رہتا ہے کہ کس طرح ہم پیسہ کما سکیں، حالانکہ اللہ نے آج تک کبھی بھی کسی کو بھوکا نہیں مارا، کیونکہ رزق دینے کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے بذات خود کیا ہے، اسی کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ نے عجیب وغریب واقعہ خود صاحب واقعہ سے سن کر سنایا، فرمایا: مفتی صادق صاحب مجددی افغانستان میں سفیر تھے، انہوں نے خود بتایا کہ ایک مرتبہ روس کے صدر کو افغانستان کے صدر کے یہاں کچھ پیغام دینا تھا، تو اس کا ٹیلی فون آیا کہ اپنے کسی آدمی کو بھیج دو، جس سے براہ راست میں بات کرسکوں، کیونکہ ٹیلی فون وغیرہ سے وہ بات کرنا مشکل ہے ، انہوں نے بتایا کہ اس کے لیے میرا انتخاب ہوا، ادھر روس کے اس وقت حالات بہت خراب تھے، تو انہوں نے سوچا کہ کھانا ایسا پکوالیں جو ایک ہفتہ تک چل جائے، کوئی سوکھا کھانا ہونا چاہیے، کیونکہ دیندار آدمی تھے، اور حرام کے شائبہ سے بھی محفوظ رہنا چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے ایک بڑا ناشتہ دان کھانے کا تیار کیا، اور ہوائی جہاز سے توشہ کے ساتھ سفر طے کیا، اور تاشقند میں اترے، اچانک وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت مری ہوئی چڑیا کو ادھیڑ رہی ہے، اور چونکہ تاشقند میں اکثر مسلمان ہیں، لیکن حالات دگرگوں ہوجانے کی وجہ سے معاملات خراب ہوگئے، تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ ضرور بالضرور مسلمان عورت ہے، لہٰذا انہوں نے جا کر کہا: مردہ چڑیا کو کھانا ناجائز ہے، تو اس عورت نے پلٹ کر جواب دیا کہ: تم نہیں جانتے، اب وہ ہمارے لیے جائز ہوچکی ہے، تو انہوں نے کہا اللہ اکبر! یہ کس اللہ کے ولی کی بیٹی ہے؟ اس کے کتنے فاقے ہوچکے ہیں، کہ اب اس کے لیے مردار جائز ہوگیا!! کہنے لگے میں نے سوچا کہ میں تو یہ توشہ اس لیے لایا ہوں، کہ حلال کھانا ملتا رہے، حرام سے اجتناب رہے، تو کیوں نہ اس مجبور کے

حوالہ میں یہ پورا ناشتہ دان کر دوں، میرا اللہ مالک ہے۔

ادھر جیسے ہی ناشتہ دان انہوں نے اس کے حوالہ کیا، اور ہوائی اڈہ واپس آ گئے، کہ اچانک ایک دم سے روس کے صدر کا ٹیلی فون آیا اور کہا کہ ہم کو تم سے جو بات کرنی تھی وہ ہو چکی، اب ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ واپس جا سکتے ہیں، تو یہ ہے وہ ذمہ جو اللہ تعالیٰ نے لیا ہے کہ وہ ہر بندہ کو کسی نہ کسی صورت میں رزق دے کر رہے گا، اسی واقعہ پر غور کیجئے کہ اللہ نے اپنی ایک نیک بندی کے لیے افغانستان سے ہوائی جہاز پر کھانا بھجوا دیا۔

اصحاب دعوت سے خطاب

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: دعوت کا کام کرنے میں ایک بات کا خیال رہنا چاہیے، وہ یہ کہ داعی پہلے اپنا جائزہ لے کہ وہ اپنے مخاطب کو سمجھانا چاہتا ہے یا اپنے سامنے والے کو زد دے کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہتا ہے، اگر بھڑاس ہی نکالنا مقصود ہے تو یہ "وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر" کے خلاف ہوگا، کیونکہ اس کام میں بھڑاس نکالنا مقصود نہیں ہے، بلکہ ہدایت دینا، اور راہ دکھانا مقصود ہے، البتہ اگر اس کو سمجھانا ہی چاہتا ہے تو پہلے اپنے دل پر پتھر رکھ لے، پھر اس سے بات کرے۔

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ تشریف فرما تھے، ایک صاحب آئے اور کہنے لگے حضرت فلاں شخص کو میں نے دنداں شکن جواب دیا، تو حضرت نے خاموشی سے فرمایا کہ آپ نے تو اس کے دانت ہی توڑ دیئے، بے چارہ کھانا کیسے کھائے گا؟- اسی کو میں نے ایک جگہ تقریر میں عرض کیا، کہ دانت تو پہلے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو کچھ ہضم نہیں ہو رہا ہے، دانت لگا دیجئے تا کہ ہاضمہ درست ہو جائے، کیونکہ آج اکثر لوگوں کا فکری ہاضمہ درست نہیں ہے- لہٰذا اس وقت ہم کو یہ ضرورت نہیں ہے، کہ ہم دانت توڑ دیں، بلکہ ہم کو دانت لگانے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں ہونا چاہیے کہ اگر ہم میں سے کسی کو دعوت واصلاح کا فریضہ

انجام دینا ہے تو پہلے دل پر پتھر رکھ لے، اس کے بعد میدان میں آئے۔

اہل برما سے خطاب

حضرت مولاناؒ نے برما کی ایک تقریر میں فرمایا: میں آپ سے دو باتیں کہتا ہوں، ایک تو یہ کہ مسلمان نرم ہو گئے ہیں، جس کو اگر یوں کہیں گے تھالی کا بیگن ہو گئے ہیں تو شاید درست ہو، لہٰذا ان سے یہ کہیے کہ آپ محنت کریں تا کہ فولاد ہو جائیں، اور ہمارے غیر مسلموں کے دل پتھر ہیں، اور فولاد ہیں، ان پر محنت کیجئے کہ وہ نرم ہو جائیں، فرمایا: ان دو کاموں کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے، اور پھر یہ کہا کہ اگر آپ یہاں کام نہیں کریں گے، تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ اندلس میں سب کچھ تھا، لیکن ان دو چیزوں سے وہاں کے لوگوں نے کنارہ کشی کی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کان پکڑ کر باہر نکال دیا، چنانچہ آج یہی صورت حال ہمارے سامنے برما کی بھی ہے جہاں حضرت مولاناؒ نے یہ بات فرمائی تھی، اور آج تک برما میں لوگ یہ تقریر یاد بھی کرتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مولانا کے جانے کے تین سال بعد ہماری دوکانوں پر تالے پڑ گئے، اور پورے برما میں مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک ہوا، جو آج تک ہو رہا ہے، افسوس کہ لوگ اس وقت سمجھ نہ سکے۔

اور برما میں ایک جگہ یہ بھی حضرت مولاناؒ نے فرمایا: اگر مجھے موقع ملتا تو میں تاجروں سے کہتا کہ دس سال کے لیے اپنی دوکانیں بند کر دو، دس سال کے لیے اپنے کارخانوں کو چھوڑ دو، اور دس سال دعوت کی محنت کر لو، فرمایا: میں کہہ رہا ہوں کہ دس سال کے بعد تمہاری دوکانیں چمک جائیں گی، اور جتنا تم کو اب نفع نصیب ہو رہا ہے، اس کے بعد اس سے دس گنا نفع ہو گا، لیکن اس بات کو بھی انہوں نے نہیں سمجھا۔

تاریخی وصیت

حضرت مولاناؒ نے ایک موقع سے فرمایا: یاد رکھو! یہ بات میں کہہ کر جا رہا ہوں

،،بہت سے زیغ وضلال میں مبتلا لوگ آئیں گے، آپ ان کے چکر میں ہرگز مت پڑنا، شریعت محمدی کے تعلق سے جو میں بتا کے جارہا ہوں اسی پرعمل پیرا رہنا، کیونکہ جب سے لوگوں نے اس کو چھوڑا ہے، تو کوئی ادھر بھاگ رہا ہے، کوئی ادھر بھاگ رہا ہے، عقیدہ توحید بھی ختم ہوتا چلا جارہا ہے، نہ ہی یہ بات مستحضر رہتی ہے کہ ساری کائنات اللہ نے بنائی ہے اور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ان سب کا چلانا، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے اپنے عقیدہ کی اصلاح کریں اور شریعت کے احکامات پر سو فیصد عمل پیرا ہو جائیں۔

میڈیا کی ذمہ داری

حضرت مولاناؒ نے میڈیا کے سلسلہ میں تمام ایڈیٹروں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا اور فرمایا: ایک شاعر نے فارسی میں شعر پڑھا ہے، جس میں اس نے اپنے محبوب کو مخاطب کیا ہے کہ

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیر قدمت ہزار جان است

تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا: میں نے اس میں اپنے صاحبان قلم کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی سی تبدیلی کردی ہے کہ

آہستہ مخرام بلکہ مخرام
زیر قلمت ہزار جان است

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میاں ذرا سوچ سمجھ کے چلو، ہلکے چلو، بلکہ نہ چلو، تو اچھا ہے، کیونکہ تمہارے پیر کے نیچے بہت سی جانیں ہیں، تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا آپ حضرات کے ہاتھ میں قلم ہے جو چاہے لکھ دیں، اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر لکھیں، ایسا نہ ہو کہ آپ کے نوک قلم سے کچھ نکلے اور بہت سے گاؤں اجڑ جائیں، کہیں آگ لگ جائے، کہیں اور فتنہ پیدا ہو جائے، اس لیے لکھنے والوں کو اور میڈیا میں کام کرنے

والوں کو پوری طرح یہ سمجھنا چاہیے کہ کیا چیز دینی ہے؟ کیا نہیں دینی ہے؟ اور کتنی دینی ہے؟ اور کس کو بڑھا کر دینا ہے؟ اور کس کو کس کیٹگری میں دینا ہے؟ یہ ساری باتیں آپ کے سامنے ہونا چاہئیں، ورنہ تو آج کل میڈیا کا دور ہے، جس میں جھوٹ کو سچ، اور سچ کو جھوٹ کرنا عام بات ہوگئی ہے۔

جاہلیت کی شناعت

شریعت اسلامیہ میں جاہلیت کو اپنانا بہت برا سمجھا گیا ہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "من تعزی علیکم بعزاء الجاهلية فاعضوه بأبيه ولا تكنوا" (کنز العمال) اس حدیث کے تعلق سے ہمارے حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اتنی سخت بات کبھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز وروزہ کے تعلق سے بھی نہیں فرمائی، جو اس طرح خانوں میں تقسیم کرنے والے، بانٹنے والے، جاہلیت کا نعرہ لگانے والے، برادری وادی کا نعرہ لگانے والے، قومیت کا نعرہ لگانے والے اور بے جا وطنیت کا نعرہ لگایا جانے پر ارشاد فرمائی۔

علم دین سے اعراض

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جب وہ اپنی زندگی کی، یا اپنے کاروبار کی اور دنیوی امور کی باتیں کریں گے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سڑک پر بہت شاندار گاڑی چل رہی ہے، لیکن جب ان کے سامنے آخرت کا تذکرہ کر دیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دم گاڑی کے چاروں پہیے بھسٹ ہوگئے، اسی کو قرآن مجید نے بیان کیا ہے ﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُم مِّنْهَا عَمُونَ﴾

مسئلہ ارتداد

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: پہلے جب آدمی دین سے مرتد ہوتا تھا تو اپنا سب کچھ چھوڑ

کر چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ شہر تک چھوڑ دیتا تھا، اور کہیں دور جا کر بس جاتا تھا، لیکن آج حال یہ ہے کہ ہر گھر میں ارتداد ہے لیکن اس کا کوئی علاج کرنے والا نہیں ہے، (ارتداد کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کا مستقل رسالہ بھی ردۃ ولا أبـکر لھا، کے نام سے موجود ہےؒ) اس کا ترجمہ "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

رشوت کا حال

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: آج رشوت کا بازار اتنا گرم ہے، کہ جب کوئی سرکاری دفتر میں جاتا ہے، اور وہاں اپنا کام کرانا چاہتا ہے، تو اگر چالاک اور سمجھدار آدمی ہے تو وہ نوٹ اپنی سامنے والی جیب میں رکھتا ہے کہ سامنے والا آدمی (سرکاری ملازم) دیکھ لے کہ یہ مشکل کشا موجود ہے، لیکن وہ شخص اس غریب کا چہرہ نہیں دیکھتا ہے کہ وہ بے چارہ کتنا پریشان حال ہے، اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہے، گھر میں اس کے پاس پیسے نہیں ہیں، یہ کوئی نہیں دیکھے گا کہ اس کے چہرہ کی لکیریں کیا ہیں؟ البتہ یہ ضرور دیکھیں گے کہ جیب میں کیا ہے؟ اگر جیب میں کچھ ہے تو اس کا کام جلد از جلد ہوگا، کیونکہ وہ پیسہ نکال کے دیتا چلا جائے گا۔

دو روزے

حضرت مولاناؒ نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا: ایک چھوٹا روزہ ہے، اور ایک بڑا روزہ ہے، رمضان کا روزہ چھوٹا روزہ ہے، جو کہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے، کہ اتنے وقت میں آپ کو بہت سے کام کرنے ہیں، اور کچھ کام نہیں کرنے ہیں، مثلاً: کھانا نہیں ہے، پینا نہیں ہے، اور جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے وہ کام نہیں کرنا ہے، تو یہ کام نہیں کرنا ہے، باقی آپ اور کام کر سکتے ہیں، آپ دوکان جا سکتے ہیں، آپ ملازمت کر سکتے ہیں، آپ اس کے علاوہ جتنے بھی کام ہیں سب کر سکتے ہیں، لیکن نہ کھانا ہے نہ پینا ہے، اور جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے ان میں

سے کوئی کام نہیں کرنا ہے، اور ایک اس سے بڑا روزہ ہے جو بالغ ہونے کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور انتقال تک رہتا ہے، جس کی مشق اس چھوٹے روزے سے کرائی جاتی ہے کہ جائز اور حلال چھڑوا دیا گیا، یعنی کھانا پینا جائز، لیکن اتنے گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیا، اللہ کے لیے چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے آپ کے لیے اور ہمارے لیے یہ آسان کردے گا کہ بالغ ہونے کے بعد جو کرنا ہے ہم وہ کرنے والے بن جائیں گے، کیونکہ جو حلال چھوڑ سکتا ہے اس کے لیے حرام کا چھوڑنا آسان ہو جائے گا۔

اسی کے تعلق سے حضرت مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا سے آدمی جب رخصت ہوگا اور رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام جب وہاں جام کوثر اپنے ہاتھ سے پلائیں گے تو اس وقت اس بڑے روزہ کا افطار ہوگا، اور جس طرح ایک روزہ دار جب روزہ کھولتا ہے تو اس کو خوشی ہوتی ہے، ایسے ہی اس کو وہاں خوشی ہوگی، جب اس کو جام کوثر رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام کے ذریعہ سے ملے گا، اور رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام خود اس کو عطا فرمائیں گے، تو یوں کہہ لیجئے کہ باطن کو اور نیت کو درست کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ روزہ عطا فرمایا ہے، جس قدر ہم اپنی نیتوں کو درست کرنے کا اہتمام کریں گے، اسی قدر ہمارا یہ روزہ اچھا ہوتا چلا جائے گا۔

صورت اور حقیقت

حضرت مولاناؒ نے ''صورت اور حقیقت'' مضمون میں لکھا ہے کہ صورۃً ہم مسلمان ہیں لیکن حقیقۃً ہم مسلمان نہیں ہیں، لہٰذا صورت اور حقیقت کا جو فرق ہے وہ باقی رہے گا، لکھنؤ کے Zoo میں آپ جائیے تو شیر کی، لومڑی کی، تصویر دکھائی دے گی، لیکن ظاہر ہے کہ وہ صورت ہی میں ہیں حقیقۃً نہیں ہیں، اس لیے اس کا کوئی خوف نہیں ہوتا، ایک بچہ بھی اس کے ساتھ کھیل سکتا ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں ایک جنگل کا شیر ہے، جس کے کوئی قریب بھی نہیں جا سکتا، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ صورت اور حقیقت

میں زمین آسمان کا فرق ہے، ایسے ہی مسلمانوں کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت ہے، اب اگر مسلمانوں کے اندر حقیقت پیدا ہو جائے، تو ظاہر ہے کہ کسی کی بھی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ نگاہ اٹھا کر دیکھ سکے، اور اگر صورت ہی میں رہیں گے تو ظاہر ہے کہ ہر ایک ہمارے اوپر چڑھ جائے گا، جیسے لوگ کھیتوں میں ایک نقلی انسان کھڑا کر دیتے ہیں، جس سے جانور بھاگتے رہتے ہیں، اتفاق سے ایک روز اس کے سر پر سیانا کوا بیٹھ گیا، تو سب راز کھل گیا، اور بھرم جاتا رہا، تو آج ایسے ہی ہمارا بھرم ختم ہو چکا ہے، ابھی تک بھرم تھا تو بھرم پر چل رہے تھے، یعنی صورت پر چل رہے تھے، لیکن اب ہمارے یہاں جو صورت تھی وہ بھی چلی گئی، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر وہ درجہ پیدا کریں جس سے صورت کے ساتھ حقیقت والی زندگی بھی میسر ہو سکے۔

دل کا قبلہ درست ہو

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: اس وقت معاصی اور گناہ اتنے بڑھ چکے ہیں، کہ اولیاء اللہ کے قلوب بھی متاثر ہیں، جس طرح موٹریں جب چلتی ہیں تو اس کے دھوئیں سے سارے ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں، ایسے ہی آج ہر طرف گناہ کی جو گرم بازاری ہے اس میں جو لوگ گناہ نہیں کر رہے ہیں وہ بھی اس سے متاثر ہیں، اور ان کے دل پر بھی اس کے اثرات پڑ رہے ہیں، اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو مانتے ہیں لیکن اس کو دھونے کی فکر نہیں کرتے، بلکہ اور بگڑتے چلے جاتے ہیں، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عالم قطب نما ہوتا، [illegible] کہ وہ قبلہ بتائے، آپ قطب نما کو کسی بھی سمت میں [illegible]، لیکن [illegible] وہ یہی بتائے گا کہ قبلہ ادھر ہے، لیکن ہم لوگوں کا ایسا قطب نما [illegible] چکر کھا جاتے ہیں، پھر جو چاہے چکر میں گھما دیتا ہے، اور ہمارا قبلہ بدل جاتا ہے، حالانکہ قبلہ نہیں بدلنا چاہیے، کیونکہ قبلہ ایک ہی ہے، اور قبلہ اگر بدل جائے گا تو پھر حالات ضرور خراب ہوں گے، اس لیے کہ ہمارا قبلہ بدلا ہوا ہے

،اور اگر قبلہ درست ہے تو حالات بھی درست رہیں گے، اس لیے کہ قبلہ درست ہے۔

ولایت کا سہل نسخہ

حضرت مولاناؒ نے ایک مرتبہ فرمایا: آج ہمارے معاشرہ میں عبد الرحمٰن، عبدالرحیم، عبداللہ جیسے نام تو خوب ہیں، لیکن پتہ نہیں اللہ میاں کے رجسٹر میں یہی نام لکھا ہے یا کوئی دوسرا نام درج ہوگا، کیونکہ مذکورہ بالا اسلامی ناموں کا تقاضہ تو یہ ہے کہ انسان حلال کھائے، اور اتباعِ سنت کا پابند ہو، تب ان ناموں کا حق ادا ہوگا اور وہ اللہ کا ولی بھی بن سکتا ہے، یہ بہت آسان نسخہ ہے، لیکن کھانا حلال ہی ہو، ورنہ حرام لقمہ بالکل بم کی مانند ہے، جو کہ اندر اترتے ہی سارا روحانی نظام تہس نہس کردے گا۔

محل نگاہ کیا ہو؟

حضرت مولاناؒ ایک مرتبہ کسی جلسہ میں تشریف لے جارہے تھے، اچانک راستہ میں ایک پوسٹر لگا ہوا ملا، جس میں ناموں کے ساتھ بڑے بڑے القاب لگے ہوئے تھے، اس کو دیکھ کر حضرت مولانا مسکرائے، اور ''حامیِ سنت، ماحیِ بدعت'' کے القاب کو دیکھ کر ارشاد فرمایا: پورے ہندوستان میں دو یا تین ہی شخصیتیں ایسی ہیں جن پر یہ لقب فٹ آتا ہے، لیکن آج مفت میں ایسے ہی کوئی کچھ بنا ہوا ہے، کوئی کچھ بنا ہوا ہے، بلکہ آج کل تو خود غرضی وخود پسندی بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اپنے منھ سے بھی لوگ خود کہہ دیتے ہیں کہ میں فلاں بول رہا ہوں، اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج اوپر سے نگاہ ہٹ کر اپنے اوپر آکر جم چکی ہے، اگر یہ یہاں سے نگاہ ہٹ جائے، اور اوپر کی طرف چلی جائے، تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔

غیرت وحمیت کا محل

حضرت مولاناؒ نے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا، یہاں تک

کہ اعیان حکومت سے مولاناؒ کا ملاقات کرنے کا مزاج بالکل نہیں تھا، لیکن جب ہندوستان میں مسلمانوں کا مسئلہ پیش آیا تو مولانا بذات خود وہاں تشریف لے گئے، لیکن انفرادی طور پر حضرت مولاناؒ کا معمول یہ تھا کہ سیاسی لیڈران میں سے کوئی ملنے والا بھی آجاتا، تو آپ کو بہت گراں گزرتا تھا، چہ جائیکہ خود جانا پسند فرماتے، ایک مرتبہ ندوۃ العلماء میں اندرا گاندھی اچانک پہنچ گئیں، حضرت مولاناؒ مسجد میں تشریف فرما تھے، فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ میرے پیچھے سے آرہی ہیں، اور سامنے دروازہ ہوتا تو میں اس سے باہر نکل جاتا، اور اسی استغنائیت کی وجہ سے حضرت مولانا کا یہ حال تھا کہ جو بھی حق بات کہنا ہوتی، اور وہ جس سے بھی متعلق ہوتی، تو اس کا برملا اظہار فرمادیتے، یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی کے منھ پہ اسی کے گن گائے ہوں، بلکہ جس کی جو خامی تھی اور وہ ملک وملت کے لیے مضر ثابت ہوسکتی تھی تو اس کا اظہار بلا کسی جھجک کے سر عام حکمت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا، لیکن ذاتی طور پر آپ ایسے محتاط تھے کہ کبھی کوئی آپ کو آپ کے منھ پر اگر برا بھی کہہ دیتا تو آپ اس کو انعام سے نوازتے، بلکہ حضرت مولاناؒ اس کی اور زیادہ قدر فرماتے جو آپ کو سر عام برا کہتا تھا، لیکن اجتماعی مسئلہ میں مولانا کی غیرت وحمیت ہمیشہ بیدار رہی۔

محض علم کافی نہیں

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: آج امریکہ میں علم بہت ہے، یونیورسٹیاں بکثرت ہیں، کالجوں سے پٹا پڑا ہے، یورپ کے آپ کسی بھی ملک میں چلے جایئے، ہر جگہ کالجوں کی بالکل بارات لگی ہوئی ہے، لیکن حال یہ ہے کہ علم ہے لیکن اللہ کا نام نہیں ہے، علم ہے مگر بے برکت ہے، اسی لیے آج ان کی ایجوکیشن سے ساری انسانیت پریشان ہے، اور اگر یہی ایجوکیشن اللہ کے نام کے ساتھ ہوتی تو ساری انسانیت کے لیے سکون ہی سکون کا باعث ہوتی۔

حقیقی طالب علم کون؟

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: ایک مرتبہ نیپال جیسے پسماندہ علاقہ میں ایک طالب علم رات کو راستہ میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا، وہاں سے نواب صاحب کی سواری گزرنے والی تھی تو حسب معمول پولس کا دستہ آگے آگے راستہ صاف کراتا ہوا گزر رہا تھا، تو اس دستہ نے دیکھا ایک طالب علم راستہ میں پڑھ رہا ہے، ان لوگوں نے اس سے کہا کہ نواب صاحب آرہے ہیں، آپ یہاں سے ہٹ جایئے، راستہ صاف کر دیجئے، لیکن طالب علم طالب علم تھا، اس نے کہا میں مضارع کی گردان یاد کر رہاں ہوں، اگر ابھی تمہارے نواب صاحب سے جمع کا صیغہ پوچھ لوں تو وہ بغلیں جھانکنے لگیں گے، معلوم یہ ہوا کہ اس کو اس وقت صرف یہی دھن سوار تھی کہ گردان یاد کرنا ہے، اسی لیے صحیح معنیٰ میں طالب علم اسی کو کہتے ہیں جو اپنی تعلیم میں یکسوئی کے ساتھ لگا رہے، اور اگر کوئی ایسا محنتی طالب علم پیدا ہو جائے تو کبھی ضائع نہیں ہو سکتا، لیکن افسوس کہ آج کل تمام تر سہولیات ہونے کے باوجود بھی طلباء بجائے اس کے کہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں، ان آسائشوں کا بے جا استعمال اور کرتے ہیں۔

اخلاص واختصاص

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: اگر کسی انسان کو اخلاص واختصاص دونوں چیزیں حاصل ہو جائیں تو وہ کبھی بھی ضائع نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ اگر وہ جنگل میں بھی اخلاص کے ساتھ جا بیٹھے گا تو جنگل میں بھی منگل ہو جائے گا، اور لوگ اس کو جنگل سے اٹھا کر لے آئیں گے، کہ آپ کا جنگل میں کیا کام ہے، آپ کو تو پوری دنیا کی رہنمائی کرنا ہے۔

جانشینی کا حق

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں ایک بہروپیہ تھا جو

نئے نئے روپ اختیار کر کے حضرت اورنگ زیب کو بے وقوف بنانے آتا تھا، لیکن اورنگ زیب کہتے تھے کہ میں اس طرح کے ڈھونگیوں کو نہیں دیتا ہوں، ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تو کبھی مجھ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا تو تجھے منھ مانگا انعام ملے گا، پھر کچھ دنوں تک وہ غائب رہا، ایک عرصہ کے بعد شہرت ہوئی کہ فلاں جنگل میں کوئی بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں، جو بڑے مرتاض ہیں اور خلق خدا کو بڑا فیض پہنچا رہے ہیں، اتفاق سے بادشاہ کی سواری ادھر سے گزرنے والی تھی، تو بادشاہ نے سوچا کہ ان کی بھی زیارت کرتے ہوئے چلتے ہیں، جب بادشاہ نے قریب جا کر دیکھا تو واقعی بڑا بزرگ پایا، یہ دیکھ کر انہوں نے اس بزرگ کے نام جاگیر لکھی، اور کہا یہ جاگیر اس لیے دے رہے ہیں کہ تم اطمینان سے اپنے کام میں لگے رہو، تو بزرگ نے جواب دیا کہ فقیروں کا یہ طریقہ نہیں ہے، اور بادشاہ کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا۔

لیکن جب بادشاہ اپنی جگہ پہنچ گئے، تو بعد میں وہاں گیا، اور کہا: میاں! آج دھوکہ کھا گئے، میں وہی بہروپیہ ہوں، جو مختلف رنگوں میں آیا کرتا تھا، لیکن آپ پہچان لیتے تھے، اور اس مرتبہ جو میں نے روپ اختیار کیا تھا اس میں آپ مجھے نہیں پہچان سکے، یہ کہہ کر اس بہروپیہ نے بادشاہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا، بادشاہ نے اس واقعہ کو سن کر کہا: تم عجیب آدمی ہو جو جاگیر میں لکھ کر دے رہا تھا وہ بہت زیادہ تھی، انعام تو اب اس سے کہیں کم ملے گا، جب تم پیسے ہی کے لیے یہ سب کھیل کر رہے تھے تو وہی جاگیر لے لی ہوتی؟ تو اس نے کہا: میں نے جس روپ کو اختیار کیا تھا اگر میں اسی حالت میں جاگیر اختیار کر لیتا تو وہ روپ مکمل نہ ہوتا، یعنی اس میں بزرگان دین کا مذاق ہو جاتا، لہٰذا اس واقعہ سے ہم کو کم از کم یہ سمجھنا چاہیے کہ جب ہم علوم دینیہ سے وابستہ ہو گئے ہیں تو اس کی نسبت کا بھرم تو کسی درجہ میں باقی رکھ لیں، اور جو ذمہ داریاں ہم کو دی گئی ہیں کسی درجہ میں تو ان کو نباہنے والے بن جائیں، کیونکہ یہ انبیاء کی جانشینی ہے، لیکن آج حال یہ ہے کہ ہمارے کام جانشینی کے بالکل خلاف ہیں۔

علماء کی ذمہ داری

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: علمی حصول کی فراغت کے بعد جب طلباء کو اسناد سے نوازا جاتا ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اس کا غلط استعمال کیا جائے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک کھوئے ہوئے قفل کی چابی ہوتی ہے جوان کے حوالہ کی جاتی ہے کہ اس چابی کو آپ لے کر جایئے اور پوری انسانیت کے وہ قفل جو آج بند ہو چکے ہیں، آپ توڑیئے نہیں بلکہ اپنی اس چابی سے ان کو بآسانی کھول دیجئے، یعنی دعوت کے کام میں حکمت اختیار کرتے ہوئے ملت کو کھویا ہوا سکون واپس دلایئے۔

قرآن کا ادب

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: آپ جب قرآن مجید کے دربار میں آئیں، تو دل ودماغ میں جو فکری زیغ وضلال کا جھاڑ جھنکاڑ ہے اس کو جھاڑ کر آئیں، ذہن کو خالی کر کے آئیں، گندگی کا پیالہ بھر کر نہ لائیں، تب ممکن ہے کہ قرآن پاک کی کچھ سمجھ اللہ تعالیٰ عطا فرمادے، لیکن آپ پیالہ پہلے سے بھرے ہوئے ہیں، اور بے جا غیر اسلامی افکار آپ کے دل میں ڈیرا جمائے ہوئے ہیں، اور وہی خیالات اندر پختہ ہو رہے ہیں، اور نہ جانے کیا کیا تصورات آپ کے دل ودماغ میں پیوست ہیں؟ تو اس سب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی سمجھ حاصل ہونا ناممکن امر ہے، بلکہ اس کے لیے پہلا ادب یہی ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر کچھ حاصل کرنے کی غرض سے قرآن کے دربار میں حاضر ہوں۔

فہم قرآن کا فائدہ

قرآن مجید کی مثال بجلی کے کرنٹ کی طرح ہے، اگر انسان اس کو سمجھنا شروع کردے تو اس کی زندگی میں غیر معمولی تبدیلی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ جو جتنا قرآن کو اپنے اندر اتارے گا اتنا ہی وہ اونچا مقام حاصل کرتا چلا جائے گا، ہمارے حضرت مولاناؒ

کو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام عطا فرمایا تھا، دراصل قرآن ان کے اندر کسی درجہ میں آ گیا تھا، اسی لیے آپ نے فرمایا: میرا جتنا کام ہے وہ قرآن مجید ہی کے طفیل میں ہے، کیونکہ آپ کو اسلامی فکر کی اشاعت کے لیے مستقل کرنٹ قرآن سے حاصل ہو رہا تھا۔

ترقی کا معیار

حضرت مولانا ؒ نے فرمایا: اگر کوئی انسان متبع سنت اور پابند شریعت نہ ہو تو اس کو ہزار اجازتیں کسی سے حاصل ہوگئی ہوں، وہ غیر مفید ہیں، کیونکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اور نہ ہی ان اجازتوں کو ترقی کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اصل ترقی کا معیار اتباع سنت ہے۔

انسان کا اصل کام

آج کل انسانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہمارا اصل کام کھانا اور کمانا ہے، حالانکہ یہ تو جانوروں کا کام تھا جو آج انسانوں کا حال ہو گیا ہے، ہمارے حضرت مولانا ؒ نے ارکان اربعہ میں لکھا ہے: آج کل ہمارا معاملہ بس کھانا اور کمانا رہ گیا ہے، کھانا اس لیے تاکہ کمائیں، اور کمانا اس لیے تاکہ کھائیں، اس لیے ہماری ساری محنت دو ہی جگہ ہے، ایک ڈائننگ ہال اور ایک لیٹرین، بس وہاں جائیں اور یہاں آئیں، اتنا کام رہ گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، انسان کا کام یہ ہے کہ وہ انسانیت کا صحیح سبق سکھائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر وقت اس فکر میں رہے کہ اپنے بھائی کو کس طرح دینی و دنیوی نفع پہنچائے۔

صدائے انسانیت کا فائدہ

ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر ہمارے حضرت مولانا ؒ یہ بات کہا

کرتے تھے کہ ہمارا کام انسانیت کی صدا لگانا ہے، اگر یہ صدا سن لی گئی تو بہت اچھی بات ہے ورنہ کم سے کم صدا لگانے والوں میں نام آجائے گا کہ ہم نے بھی صدا لگائی تھی، تا کہ جب اچھے لوگوں کی فہرست بنے اور وہاں اچھے لوگوں کا نام لیا جائے تو اس میں ہمارا بھی شمار ہو سکے۔

پیامِ انسانیت کا کام

پیامِ انسانیت کا کام اصلاً نبیوں کا کام ہے، ہمارے حضرت مولاناؒ فرمایا کرتے تھے: یہ معمولی کام نہیں ہے، انبیائے کرام انسان کو انسان بنانے کے لیے آتے ہیں، کیونکہ وہ انسان کامل ہوتے ہیں، ان کو اللہ کی طرف سے یہ حکم ملتا ہے کہ وہ انسانوں کو انسان بنائیں، اور ان کو وہاں سے ایک پیغام ملتا ہے جس پیغام کو وہ لیتے ہیں، اور اس پر خود عمل کرتے ہیں، اور پھر ساری انسانیت کی رہنمائی کے لیے آگے آتے ہیں۔

انسانیت کا تعارف

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: اس ملک میں ہماری پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم برادرانِ وطن کی سطح کے مطابق بات کریں، اور برادرانِ وطن کو سمجھائیں کہ ہم لوگ دہشت گرد نہیں ہیں، ہم انسانیت کے ماننے والے ہیں، لیکن یہ کہہ کر ہی نہیں ہوگا بلکہ ضروری یہ ہے کہ اس کو ایجابی طور پر پیش کر کے دکھایا جائے، وہ اس طرح کہ ان کے ساتھ ہم کو اچھا سلوک کرنا چاہیے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے حالات خود بخود درست ہو جائیں گے، لیکن اس کام کو لے کر ہم کو آگے بڑھنا ہے اور اس کی ترتیب بھی بنانا ضروری ہے۔

ہمارے حضرت مولاناؒ جب تقریر میں فرماتے تھے کہ بھائیو! ملک کیسے بچایا جائے؟ تو برادرانِ وطن کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ قریب آتے تھے، یہاں تک کہ بعض بڑے پروفیسر حضرات بھی مولانا کے پاس

آئے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، کیونکہ اس وقت ہر ایک کو ایک قلبی سکون درکار ہے، اور وہ سکون صرف اور صرف مذہب اسلام میں ہی ہے، بقیہ سارے مذاہب کا دیوالیہ نکلا ہوا ہے، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پہلے اپنے آپسی جھگڑوں سے باہر نکلیں اور پھر لوگوں کو صحیح راہ دکھائیں، کیونکہ اس میں بہت بڑا ثواب بھی ہے۔

پیام انسانیت کا تعارف

ہندوستان میں پیام انسانیت تحریک کے داعی اول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا: پیام انسانیت کی تحریک ملک کی تمام دینی، تعلیمی، وعلمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت وتحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے، کیونکہ کم سے کم اس کی حیثیت وہ ضرور ہے جو کسی فراش، یاسقہ، یازمین برابر کرنے والے، یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی بھی جلسہ یا اجتماع ہوسکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو یا تعلیمی بحث ومذاکرہ کا۔

مشورہ مسنون ہے

ہم سب کو اپنے اجتماعی وانفرادی معاملات میں اپنے بڑوں سے مشورہ کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ یہ عمل سنت بھی ہے، بزرگوں کا معمول بھی ہے، اور نفع سے بھی قریب تر ہے، لیکن آج اس سنت سے عام طور پر لوگوں کی زندگی میں روگردانی دیکھی جارہی ہے، ہمارے حضرت مولاناؒ کتنے بڑے آدمی تھے، لیکن حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ سے جاکر ضرور مشورہ کرتے تھے، کوئی بھی معاملہ پیش آتا، تو وہاں جاکر پوچھتے، ایسے ہی اس وقت ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے اکابر سے اہم امور میں ضرور مشورہ لیں، یہ اکابر کا بھی معمول رہا ہے۔

اتباع سنت کا نتیجہ

حضرت مولاناؒ کے اتباع سنت ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ آخری وقت میں حضرت مولاناؒ نہا دھوکر، شیروانی پہن کر، عطر لگا کر، رمضان المبارک کے مہینے میں، جمعہ کے دن دربار خداوندی میں حاضر ہوئے، مزید یہ کہ سورہ یٰس پڑھتے ہوئے دنیا سے تشریف لے گئے، انتقال کے بعد قبر سے ۶ رمہینے تک خوشبو آتی رہی، قبر سے نکل کر پوری مسجد اور اطراف میں پھیل جاتی تھی، اور آج بھی حضرت مولاناؒ کی کتابوں میں یہ تاثیر ہے، کہ آدمی کا ذہن مطالعہ کرتے ہی بدل جاتا ہے، لیکن ایسے لوگوں کو دیکھ کر آدمی ایک دم متاثر نہیں ہوتا، بلکہ دھیرے دھیرے جب خدمت میں جائے گا تو محبت بڑھتی جائے گی، ایک دم سے متاثر ہونا بھی اس کے باطل ہونے کی علامت ہے۔

عفو و درگزر

ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ تشریف فرما تھے، ایک صاحب آئے، ان کا حضرت مولاناؒ نے بہت غیر معمولی اکرام کیا، اور ان کے لیے نہ جانے کیا کیا کھانے کو منگایا، بہت قریب بھی بٹھایا، اور جب وہ صاحب رخصت ہو گئے تو حضرت مولاناؒ کے ایک بہت خاص خادم نے دریافت کیا کہ حضرت! معاف کیجئے یہ صاحب جو آئے تھے ان سے میرا جی نہیں لگ رہا تھا، تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا: یہ صاحب ایسے ہیں کہ اگر ان کو موقع مل جائے تو مجھے قتل کر دیں، لیکن جب وہ میرے پاس آئے ہیں، تو میرا دل ان سے صاف ہے، اس لیے میں ان کی خدمت کرر ہا تھا، یہاں تک کہ حضرت مولاناؒ کا تو معاملہ یہ تھا جس کو میں اپنے ساتھیوں سے بیان بھی کیا کرتا تھا: اگر تم کو مولانا سے کچھ تحفہ لینا ہے تو ان کے سامنے جا کر ان کو برا بھلا کہہ دو، مجھے یقین ہے کہ تم کو ضرور ہدیہ ملے گا، اور تمہارے ساتھ حضرت مولاناؒ اچھا سلوک کریں گے۔

اخفائے حال

حضرت مولاناؒ کے تعلق سے ان کی والدہ ماجدہ نے اور خود حضرت مولانا نے اپنے تعلق سے بہت مبارک اور غیر معمولی خواب دیکھے، جو آپ نے نہ کبھی تحریر کئے اور نہ عام طور سے بیان کرتے تھے، البتہ بطور بشارت ان سے خوش ضرور ہوتے تھے، اگر کبھی بیان کرتے تو اپنی ہمشیرہ سے اور بہت خاص لوگوں سے بیان فرماتے تھے، البتہ میں نے گھر میں ساتھ آنے جانے کی وجہ سے آپ کے بعض غیر معمولی خواب سنے ہیں، اور مجھے وہ یاد بھی ہیں، لیکن جو لوگ حضرت مولاناؒ کے تعلق سے کچھ خواب بیان کرتے تھے، آپ اس پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے، بلکہ ایک جملہ کہہ کر تذکرہ ختم کر دیتے کہ میں اس لائق نہیں ہوں، اور اپنے تعلق والوں کے لیے بھی یہی پسند فرماتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے ایک صاحب کو جن کا کشف وخواب کا مشغلہ تھا ان کو زبانی بھی اور خطوط میں بھی منع کیا، کہ اس فعل سے وہ باز رہیں، اسی لیے بعض دفعہ ان کی تحریر کو تکدر کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں بھی ڈال دیا۔

وہ کوہ کن کی بات

جب ہندوستان میں وندے ماترم کا مسئلہ پیش آیا، تو ہر جگہ سے فتاوی آتے رہے، لیکن حضرت مولاناؒ کے پاس جب انٹرویو والے آئے، اور دریافت کیا کہ آپ کی ایسے حالات میں کیا رائے ہے؟ تو آپ نے بڑی سادگی سے فرمایا: ہم اپنے لوگوں سے کہہ دیں گے کہ بچوں کو ہٹا لیں، یعنی جہاں سرکاری اسکولوں میں یہ گیت پڑھایا جا رہا ہے وہاں سے مسلمان حضرات اپنے بچوں کو ہٹا لیں، یہ مختصر سا تاریخ ساز وہ جملہ تھا کہ پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا، اس وقت بی جے پی کی حکومت تھی، وہاں کے وزیر معافی مانگنے آئے، تعلیم کے وزیر کو استعفیٰ دینا پڑا، اس کو معزول کیا گیا، اور پھر از خود حکومت نے یہاں آکر

حضرت مولاناؒ سے معافی مانگی، یوں تو اس مختصر سے جملہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ایک باوزن شخص کی زبان سے نکلا ہوا باوزن جملہ تھا، جس کی حکومتِ وقت کو چار وناچار قدر کرنی پڑی، یہی وزن کی بات تھی کہ ایک وقت وہ بھی حضرت مولاناؒ کے اوپر آیا جب آپ کے خلاف بڑی پرزور مہم چلائی جارہی تھی یہاں تک کہ یہ اطلاعات بھی ملیں کہ حضرت مولاناؒ کو شاید جیل لے جائیں، جب حضرت مولانا کے پاس یہ خبریں پہنچی تو آپ نے فرمایا: بھائی! اگر ایسا وقت آیا تو عبدالرزاق کو لے کر چلا جاؤں گا، لیکن ایسی خبریں صرف فضا ہی میں منڈلاتی رہیں، زمین پر آج تک نہ آسکیں۔

دردِ دل

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو عجب دردِ دل عطا فرمایا تھا، اس کے تعلق سے خود میرا ایک چشم دید واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ مولانا معین اللہ صاحبؒ تشریف فرما تھے، کہ مولانا اسحاق صاحب آگئے، جو کہ بڑا اچھا کلام اقبال پڑھتے تھے، تو مولانا معین اللہ صاحب نے فرمایا: حضرت! کیوں نہ اشعار کی ایک مجلس ہوجائے، اس پر حضرت مولاناؒ نے کچھ جواب نہیں دیا، مولانا معین صاحب نے سمجھا شاید مولانا نے نہیں سنا ہے، پھر کہا، جب کوئی جواب نہیں ملا تو پھر تیسری مرتبہ کہا، یہاں تک کہ عشاء کے کھانے سے فراغت کے بعد پھر مولانا معین اللہ صاحب نے کہا: حضرت اسحاق آئے ہوئے ہیں ایک مجلس ہوجائے، تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا: میاں معین اللہ! تم تو مزا لے کر سوجاؤ گے، لیکن مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی، پھر گولی بھی کھاؤں گا جب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا، یہ وہ تڑپ تھی، جس کو اندر کی سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی کسی انسان کے اندر دردِ دل کا پیدا ہوجانا اسی طرح ایک مرتبہ میں نے حضرت مولاناؒ کو دیکھا کہ تین مرتبہ انگلی اٹھا کر فرمایا اللھم فاشھد اللھم فاشھد، اے اللہ تو گواہ رہنا سب کچھ تو کہہ دیا ہے، یہی وجہ تھی کہ اگر آپ کبھی کسی کو برے حال میں دیکھتے تھے تو بے

چین ہو جاتے تھے، اسی وجہ سے مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس ملک میں غیروں کا بھی حق ہے، ان کو بھی ہدایت کے راستہ پر لانا ہمارا فریضہ ہے۔

فراست ایمانی

حضرت مولاناؒ نے فرمایا: میں لوگوں کو بخوبی جانتا ہوں، یہاں تک کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان کو کس قدر جانتا ہوں تو وہ میرے پاس آنا چھوڑ دیں، اسی لیے بہت سے وہ لوگ جو حضرت مولاناؒ کے بہت مقرب تھے، لیکن میں ان کے بارے میں حضرت مولانا کی رائے جانتا ہوں کہ کیا ہے؟ کیونکہ مولانا بالکل نوٹ چیک کرنے کی طرح فوراً آدمی کو دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ یہ کیا ہے؟ اسی لیے حضرت مولانا اس تعلق سے بڑا پریشان رہتے تھے اور لوگوں کو اس طرح کے حال میں دیکھ کر بہت روتے تھے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے؟ اور یہ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ کیونکہ مولانا اپنی فراست ایمانی سے لوگوں کو بخوبی پہچان لیتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ہمارے حضرت مولاناؒ اگر کسی سے ایک بار نظریں پھیر لیتے تھے، تو جیسا کہ ابن ہمام نے امام بخاریؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ اذا قال الامام البخاری: فیہ نظر فلا یصلح للاعتبار والاستشھاد، یعنی حضرت امام بخاریؒ صرف اتنا کہہ دیں کہ یہ قابل غور ہے تو وہ کام سے گیا، اور دوسرا اسی بات کو اس کے بالمقابل کتنا ہی کہے لیکن اس کی بات نہیں مانی جائے گی، کیونکہ یہ صرف مقام اور بلندی کی بات ہے، اسی طرح ہم نے حضرت مولاناؒ کو دیکھا تھا کہ اگر کسی کے بارے میں صرف منھ موڑ لیا، تو ہم سمجھ لیتے تھے کہ وہ بے چارہ کام سے گیا، اور اگر ایک دو جملہ بھی کہہ دیا تب تو سمجھئے کہ بالکل ہی کام سے گیا، میں اس بات کو مولانا کے ساتھ رہتے رہتے خوب پہچانتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولاناؒ انتہائی نرم مزاج تھے کچھ بھی نہیں بولتے تھے، یہ تو بہت بعید ہے کہ آپ کسی کو کچھ کہتے، ہم نے تو پوری زندگی مولانا کی زبان سے کوئی گھٹیا لفظ نکلتے ہوئے نہیں

دیکھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ نے آپ کو حلاوت ایمانی سے مالا مال فرمایا تھا۔

حسن سلوک

رشتہ داروں کے ساتھ اچھائی کا معاملہ برتنا بڑے دل گردے کی بات ہے، اسی لیے جو اس میں کامیاب ہے وہ سب سے بڑا متبع سنت ہے، اگر ہم حضرت مولاناؒ کو اقرباء کے ساتھ حسن سلوک کے باب میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آپ اس کے اندر بھی غیر معمولی مقام رکھتے تھے، آپ کا جو جتنا زیادہ قریبی رشتہ دار ہوتا تھا اس کا اتنا ہی زیادہ خیال رکھتے تھے، اس کا ایک واقعہ بھی ہے کہ حضرت مولاناؒ کے ایک رشتہ دار تھے جو مولانا کے عصبہ میں سے تھے (عصبہ کہتے ہیں باپ کے رشتہ دار کو، جن کا رشتہ شریعت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے) ایک دفعہ ان کو پائجامے میں پائخانہ ہو گیا، تو حضرت مولاناؒ نے کہا کہ اس کو میں صاف کروں گا، لوگوں نے کہا حضرت آپ یہ کام کیوں کریں گے؟ حضرت مولاناؒ نے فرمایا: میں اس لیے کروں گا کیونکہ یہ میرے قریب کے رشتہ دار ہیں، اور مجھ پر ان کی دیکھ بھال کا زیادہ حق ہے، لیکن آج ہم لوگ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مولاناؒ بہت بڑے آدمی تھے، ان کے لیے ہوائی جہاز کھڑے رہتے تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے حضرت مولاناؒ بھی پہلے چھوٹے تھے پھر بڑے ہوئے۔

صدق نیت کے فوائد

ہمارے حضرت مولاناؒ کا خاص اور سب سے اہم و بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہر کام اللہ کے لیے کرتے تھے، اللہ کے لیے تقریر کرتے تھے، اللہ کے لیے باہر جاتے تھے، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بلند کر دیا، یہاں تک کہ ان کا چلنا، ان کا بیٹھنا، ان کا اٹھنا سب اللہ کو پسند آیا، اور ساری دنیا میں ان کی خوشبو پھیل گئی، اور ساری دنیا میں ان کو ماننے والے بن گئے، اور ساری دنیا ان کی عزت کرنے والی بن گئی، اور آج بھی یہ حال ہے کہ

ان کے نام کا سکہ رائج الوقت ہے، سارے عالم میں ان کا نام چل رہا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے محبوب تھے، اور جو اللہ کا محبوب ہوتا ہے، اللہ ساری دنیا میں اس کا نام چلا دیتا ہے، اور اس کی محبوبیت ہر جگہ پھیلا دی جاتی ہے، اور اس کی خوشبو پھیلتی چلی جاتی ہے، جس کو لوگ سونگھتے ہیں، اور ان کو مزا آتا ہے، اور پھر تذکرہ بھی ہوتا ہے کہ واہ! کتنی عمدہ خوشبو ہے، جیسے اگر کوئی خوشبو لگائے ہو، اور وہ اچھی خوشبو ہو، تو سارے لوگ اسی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، بالکل یہی حال حضرت مولاناؒ کا تھا کہ آپ نے جب صدق نیت کی خوشبو لگائی، تو سارا عالم آپ ہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

استغنائیت کے فوائد

حضرت مولاناؒ کو کبھی بھی کرسی کی طلب نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عام استعمال میں رکھی جانے والی کرسیاں بھی آپ کے پاس نہیں تھیں، بڑی مشکل سے بہت بعد میں کرسیاں آئیں تھیں، آپ کا حال تو یہ تھا کہ جہاں چاہا بیٹھ گئے، جیسا چاہا بیٹھ گئے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی کرسیوں والوں کو ان کے نیچے بٹھا دیا؟ اور کیسے کیسے بڑے لوگ ان کے آگے جھک گئے؟ اس لیے کہ وہ اللہ کے سامنے جھک گئے تھے، اور جو اللہ کے سامنے صحیح طور پر جھک جاتا ہے تو اللہ کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ ساری دنیا کو اس کے آگے جھکا دیتا ہے۔

تعلق مع اللہ کے نتائج

آخری وقت میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے متعلق سارے لوگ اس بات پر مصر ہو گئے کہ ان کو اسپتال لے چلو، کیونکہ طبیعت زیادہ خراب تھی، البتہ جب زیادہ ہنگامہ ہوا تو حضرت مولاناؒ نے خود انکار کر دیا، کہ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا، آپ لوگ بس یہیں دعا کرو، یہیں گھر میں علاج کرو، جس کی وجہ سے الحمد للہ جتنے دن بھی

رہے ایک دن بھی نماز قضا نہیں ہوئی، اور پوری زندگی ایک نماز بھی بغیر سجدہ کے نہیں پڑھی، اور کوئی نماز بھی بغیر جماعت کے نہیں پڑھی، اخیر میں کئی مہینے بستر پر رہے، لیکن پھر بھی اس سب کے باوجود آپ نے تقریر بھی فرمائی، اور فرائض کی بھی پابندی جاری رکھی، کیونکہ آپ کا اللہ سے صحیح تعلق ہو چکا تھا اور جب اللہ سے کسی کا صحیح تعلق ہو جاتا ہے تو پھر اس میں یہ ساری باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

محبت کا معیار

حضرت مولاناؒ ایک مرتبہ بھوپال کے اسٹیشن سے گذر رہے تھے، تو آپ نے حضرت شاہ یعقوب صاحبؒ کو خط میں لکھ دیا کہ میں فلاں دن ادھر سے گذروں گا، اور جس گاڑی سے مولانا کو وہاں سے گزرنا تھا اس کے بھوپال پہنچنے کا وقت عشاء کے بعد کا تھا، حضرت مولاناؒ نے اس بات پر زیادہ دھیان بھی نہیں دیا بس ایسے ہی کہلا دیا تھا، کہ ہم ادھر سے گذریں گے لہٰذا آپ دعا کیجئے گا، کیونکہ محبت بہت تھی، اور آپس کا گہرا تعلق تھا، حضرت مولاناؒ مطمئن تھے، ادھر آپ کی گاڑی لیٹ ہونا شروع ہوئی، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو گیا، اور وہاں حضرت شاہ صاحبؒ عشاء کے بعد ہی ملاقات کی غرض سے اسٹیشن پر آ گئے، اسٹیشن پر گاڑی کا اعلان ہوتا رہا، کہ آدھے گھنٹے بعد آ رہی ہے، ایک گھنٹے کے بعد آ رہی ہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، تو حضرت مولاناؒ کی جب گاڑی پہنچی، تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا: مجھے خیال بھی نہیں تھا، کہ اسٹیشن پر کوئی آیا ہوگا، کیونکہ گاڑی اتنی لیٹ ہو چکی تھی، فرماتے ہیں: میں نے سوچا پھر بھی باہر جا کر دیکھ لیں، جب دیکھا تو مولانا عمران خاں صاحب سامنے ہی کھڑے تھے، اور اس کے بعد جب حضرت مولاناؒ ان سے ملے تو انھوں نے کہا میں تنہا نہیں ہوں، حضرت شاہ صاحب بھی ساتھ میں تشریف فرما ہیں، پھر تو حضرت مولاناؒ بہت پریشان ہوئے، اسی اثناء میں شاہ صاحب بھی آ گئے، دونوں نے بہت گرمجوشی سے معانقہ کیا، حضرت مولانا

معذرت کرنے لگے، کہ حضرت اگر یہ معلوم ہوتا کہ گاڑی اتنی لیٹ ہو جائے گی تو میں کبھی آپ کو لکھتا ہی نہیں، کہ میں ادھر سے گذر رہا ہوں ، بلکہ اگر معلوم ہوتا کہ یہ حضرات اسٹیشن آجائیں گے تب بھی اطلاع نہیں کرتا، میں بہت معذرت چاہتا ہوں، اور مجھے شرمندگی ہے، ندامت ہے کہ میں نے آپ کو خوامخواہ اطلاع کی، اس پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ارے مولوی صاحب! آج کی رات اتنی اچھی گذری ہے کہ شاید ایسی راتیں زندگی میں کم گذری ہوں، کیونکہ پوری رات انتظار میں اللہ کے لیے محبت کی وجہ سے گزاری ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔

چشم دید واقعہ

حضرت مولاناؒ کا ایک واقعہ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ نے سنایا، کہ حضرت مولاناؒ ایک مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کررہے تھے، کہ اچانک ایک کالا شخص سب کو ہٹاتا ہوا آیا اور مولانا کو زور سے پکڑا اور پیشانی کو بوسہ دے کر آگے بڑھ گیا، یہ دیکھ کر حضرت مولاناؒ کے ایک خادم نے جو بہت مضبوط آدمی تھے، اس کو دوڑ کر پکڑا، اور پوچھا کہ یہ بتاؤ کیا تم ان بزرگ کو پہچانتے ہو؟ اس نے جواب دیا نہیں، لیکن جب اس سے پیشانی کو بوسہ دینے کی وجہ دریافت کی، تو اس نے پہلے تو منع کیا، پھر یہ جواب دیا: میں نے ان کو بوسہ اس لیے دیا ہے کیونکہ یہ کوئی غیر معمولی آدمی ہے، دراصل ان کی پیشانی سے ایک نور نکل رہا ہے جو کہ آسمان تک جارہا ہے، میں نے اسی نور کو بوسہ دیا ہے۔

پھولوں میں گلاب

ہمارے حضرت مولاناؒ دیکھنے میں بڑے سادہ تھے، مگر وہ ظاہری اور باطنی دونوں سنتوں پر عمل کرتے تھے، ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اندر کا نور باہر پھوٹ کر آگیا ہے، ایک بار ندوہ میں بڑا اجلاس ہوا، جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے مشائخ اور علماء

آئے تھے، ندوہ میں مجلس لگی ہوئی تھی کہ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی آیا اور اس نے کہا: مجھے مولانا علی میاں صاحب سے ملنا ہے، لوگوں نے کہا کیا تم جانتے ہو؟ کہا نہیں، تو مولاناؒ سامنے بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے چاروں طرف بڑے بڑے مشائخ اور علماء اپنے اپنے لباس میں ملبوس تشریف فرما تھے، اور حضرت مولاناؒ ویسے ہی سادہ انداز میں بیٹھے ہوئے تھے، تو لوگوں نے اس کا امتحان لیا، اور کہا انہی میں سے ایک ہیں پہچان لو، چنانچہ وہ سیدھا مولاناؒ کے پاس گیا اور ان سے مصافحہ کر کے آ گیا، لوگوں نے پوچھا تم نے کیسے پہچان لیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ مولانا کا چہرہ بتا رہا تھا، دراصل اس میں راز یہی ہے کہ جو اندر کی سنتیں ہوتی ہیں ان کی اتباع سے نور پھوٹ کر باہر آتا ہے، حضرت مولاناؒ نے پوری زندگی اپنے آپ کو چھپانے کی کوششیں کیں، لیکن انتقال ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک ڈھکن تھا جو کھل گیا اور خوشبو باہر پھیل گئی۔

علمائے عرب کی نظر میں

ہمارے مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو عرب میں کوئی "مؤید من اللہ" لکھتا ہے، کوئی "آیۃ من آیات اللّٰہ" لکھتا ہے، ڈاکٹر یوسف قرضاوی صاحب نے تو لکھا ہے کہ ایک چیز ہم بھی پڑھتے ہیں لیکن وہ ذہن سے نکل جاتی ہے، اور وہی چیز مولوی صاحب بھی پڑھتے ہیں، تو نہ معلوم اس سے کیا کیا معانی نکال لیتے ہیں؟ اسی لیے حضرت مولانا کی مثال ڈاکٹر صاحب نے الرجل القرآنی، سے دی ہے، یعنی قرآنی آدمی، کیونکہ جو جتنا بڑا قرآنی آدمی ہوتا ہے اس کے اندر علم کی اتنی ہی طاقت اور انرجی ہوتی ہے۔

علمائے ہند کی نظر میں

☆ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے حضرت مولاناؒ سے فرمایا: مولانا! میں آپ کی تعریف کروں تو سامنے تعریف کرنا محبت کا اوچھا پن ہوگا، بس اتنا ضرور کہوں

گا کہ آپ کو دولت قرآن مبارک ہو۔

☆ حضرت مولانا رحمہ اللہ اپنے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کے ساتھ مرکز نظام الدین دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا الیاس صاحبؒ بہت خوش ہوئے، اور ڈاکٹر صاحب سے فرمایا: آپ کے بھائی میں ساری خوبیاں ہیں، بشرطیکہ آپ کی بات مانیں، اس پر حضرت مولاناؒ نے فرمایا: اس بات کو واقعی میں نے تجربہ میں صحیح پایا ہے، اور دو مسئلوں میں ہم نے بھائی صاحب کی بات نہیں مانی تو دونوں ہی میں رجوع کرنا پڑا، ایک جماعت اسلامی میں شمولیت، جس پر بھائی صاحب کو بھی انشراح نہیں تھا، آخر اس سے نکلنا ہی ہوا، دوسرے ہم نے ندوہ میں مکان لے کر گھر بنانا چاہا، تو اس سے بھی بھائی صاحب کو قلق ہوا، چنانچہ اسی دوران اتنی تنگی پیش آئی کہ امین آباد جا کر گھڑی بیچنے کا ارادہ کرلیا، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، البتہ پورے سال بے برکتی ضرور رہی، پھر بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم میری زندگی میں مجھ سے علیحدہ ہو گئے، بالآخر ہم نیبھائی صاحب سے رو کر معافی مانگی۔

☆ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے لاہور کی مسجد کے حوض کے کنارے معززین شہر کے سامنے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: مولوی ابوالحسن! میں آپ کی شرافت کا قائل ہوں۔

☆ مولانا لاہوریؒ نے ایک دفعہ تحریر فرمایا: مجھے آپ کی ترقی سے سارے عالم میں سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے، حتی کہ حبیب اللہ کی ترقی سے بھی زیادہ آپ کی ترقی سے خوشی ہوتی ہے۔

☆ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ حج سے واپس ہوئے تو میں نے مبارکباد کا خط لکھا، تو مولانا نے فرمایا: مجھے مسجد خیف میں تین دفعہ حکم ہوا کہ میں آپ کو اجازت دوں۔

☆ حضرت شیخ عبد القادر رائے پوریؒ نے تکیہ کی مسجد کے زینہ پر حضرت مولانا سے فرمایا: میں آپ کو چاروں سلسلوں میں اجازت دیتا ہوں، خاص طور پر حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ میں۔ (یہ واقعہ مولانا کی بیعت سے پہلے کا ہے)